جلد چہارم

افادات

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

مرتب

محمد زبیر

مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

فیضانِ معرفت

جلد چہارم

افادات

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم
بانی ومہتمم الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور
وخلیفہ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

مرتب محمد زبیر استاذ الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

مکتبہ مسیح الامت دیوبند وبنگلور

نام کتاب : **فیضانِ معرفت** جلدِ چہارم

افادات : **حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی** دامت برکاتہم

بانی ومہتمم الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم، بنگلور

وخلیفہ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

مرتب : **محمد زبیر** استاذ الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم، بنگلور

صفحات : ۲۵۵

تاریخ طباعت : شوال المکرم ۱۴۳۵ھ

ناشر : **مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور**

موبائل نمبر : 9036701512 / 09634830797

ای۔میل : maktabahmaseehulummat@gmail.com

اجمالی فہرست

فہرستِ مضامین

تلاشِ حق اور صراطِ مستقیم

اسلام میں مکمل داخل ہو جاؤ

ادب انسان کو انسان بناتا ہے

اخلاق کے بغیر انسانیت نامکمل

حقوق العباد کی اہمیت

تعمیرِ قلب

فضیلت - ضرورت - اہمیت

دلوں پر دو قسم کے حملے

شبہات ...... شہوات

باسمہٖ تعالیٰ

تمہید

حضرت اقدس دامت برکاتہم کے اصلاحی خطابات، جو ہر جمعرات بعد نمازِ مغرب ''مسجدِ بید، محلّہ بیدواڑی بنگلور'' میں ہوتے ہیں، جن سے سالکین کی کثیر تعداد فیض یاب ہورہی ہے، ان خطابات کے مجموعے کی تین جلدیں بفضلہٖ تعالیٰ شائع ہوچکی ہیں۔

یہ ''فیضانِ معرفت'' کی چوتھی جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے، جو بفضلہٖ تعالیٰ اب تکمیل کو پہنچی ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ سابقہ جلدوں کی طرح، اسے بھی قبولیت عطاء فرمائے اور امت کو فائدہ پہنچائے۔

میں مولانا نور اللہ صاحب قاسمی (استاذ جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم) اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب (نائب امام مسجدِ بید) کا اور حافظ سید محمد صہیب، محمد مدثر (متعلمان جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم) کا ممنون ومشکور ہوں کہ ان حضرات نے مجالس کی ترتیب کے سلسلے میں میرا بھرپور تعاون فرمایا؛ بل کہ یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں ہوگا کہ بیانات کی ترتیب کا یہ کام ہم سب کی کاوش ہے، تنہا میری نہیں۔ میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اِن سب کو اپنے شایانِ شان اجر عطا فرمائے۔

قارئین سے گزارش ہے کہ دعا فرمائیں، اللہ جل شانہٗ اِن مجالس کی ترتیب کے سلسلے کو مزید آگے بڑھانے کی توفیق عطا فرمائے اور امت کو نفع پہنچائے اور میرے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے اور حضرت اقدس دامت برکاتہم کا سایہ ہم پر تادیر قائم ودائم رکھے؛ تا کہ ہم آپ کے علومِ ظاہری وباطنی سے اور آپ کے مواعظِ حسنہ سے اور آپ کی صحبتوں سے فیض یاب ہوتے رہیں۔

محمد زبیر
استاذ الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم، بنگلور
۱۵/ذی الحجۃ ۱۴۳۵ھ

دینی خدام
آپس میں رفیق ہیں
فریق نہیں

باسمہٖ تعالیٰ

الحمد للّٰہ و کفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ أما بعد:

أعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ﴾

(اور ہم نے ان (بنی اسرائیل) میں سے کچھ لوگوں کو، جب انہوں نے صبر کیا، ایسے پیشوا بنادیا، جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے اور وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے۔) [الم السجدة: ۲۴]

محترم حاضرین!

اس وقت آپ کے سامنے ایک آیت تلاوت کی گئی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگوں کو ائمہ بنایا یعنی ان کو قیادت وامامت کا ایک عظیم دینی منصب عطا کیا اور اس دینی منصب پر فائز ہونے والے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنا پیغامِ ہدایت پہنچانے کی ذمہ داری دی اور یہ ذمہ داری ان کو اس وقت ملی، جب انہوں نے صبر کیا اور جب ان کو یقین کی دولت حاصل ہوگئی۔

یہ آیت کا خلاصہ اور حاصل ہے۔ یہ آیت بڑی قابلِ غور ہے، بالخصوص ان لوگوں کے لیے، جو ائمہ ہیں، علما ہیں، کسی دینی تحریک سے وابستہ ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے کام پر لگایا ہے اور وہ لوگوں میں ہدایت پھیلانے کا کام کر رہے ہیں ،اللہ کے پیغام کو پہنچانے میں لگے ہیں۔

ہدایت کا مفہوم

علمانے لکھا ہے کہ ہدایت کے دو معنی آتے ہیں: ایک معنی ہیں"اِراء ۃ الطریق"یعنی"راستہ دکھانا"، دوسرے معنی ہیں"إیصال إلیٰ المطلوب"یعنی منزلِ مقصود تک پہنچا دینا۔ منزلِ مقصود تک پہنچانے کا کام علما نہیں کر سکتے حتی کہ حضراتِ انبیا بھی نہیں کر سکتے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّکَ لَاتَهْدِيْ مَنْ أَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ﴾(اے نبی! آپ جسے چاہیں، منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتے، بل کہ اللہ جسے چاہتے ہیں، منزلِ مقصود تک پہنچا دیتے ہیں) [القصص:۵۶]

نبی جسے چاہے، اسے مؤمن بنادے، نمازی بنادے، نیک بنادے، متقی بنادے، یہ اس کے بس میں نہیں۔ یہ تو اللہ ہی کی طاقت ہے کہ وہ جسے چاہے، منزل تک پہنچادے، ولی بنادے، مؤمن بنادے۔ بنادینے کا کام صرف اللہ کا ہے، رہے حضراتِ انبیا اوران کے وارثین، تو ان حضرات کا کام صرف ہدایت کا راستہ بتانا ہے۔

ہدایت کا مرکز

آج ہدایت کا پیغام صرف قرآن وحدیث میں ہے، آج ہدایت کا پیغام نہ تورات میں ہے، نہ انجیل میں ہے، نہ زبور میں ہے، نہ صحفِ ابراہیم میں ہے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تورات کے کچھ اوراق لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور وہیں بیٹھ کر ان اوراق کو اِدھر اُدھر سے دیکھنے لگے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک غصہ سے سرخ

ہوگیا، یہ دیکھ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کانپنے لگے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: عمر! دیکھتے نہیں، اللہ کے نبی پر کس قدر غصہ ہے، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، تو وہ بھی کانپنے لگے اور پڑھنے لگے "أعوذ باللّٰہ من غضب اللّٰہ ومن غضب رسولہٖ" (میں اللہ سے اللہ اور اس کے رسول کے غصے سے پناہ چاہتا ہوں) بار بار پڑھنے لگے، تب اللہ کے نبی کا غصے کم ہوا۔

اس کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھا اور فرمایا کہ: "لو کان موسیٰ حیا لما وسِعہ إلا اتباعي" (اگر آج موسیٰ بھی زندہ ہوتے، تو ان کو بھی میری اتباع کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا)۔"

(الدارمي: ۴۳۵، ابن أبي شیبۃ: ۲۶۴۲۱)

دینی خدام کی ذمہ داری

حضرات! اس آیت میں دو باتیں بہت قابل غور ہیں:

(۱) ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داری دی، وہ کیا ہے؟

(۲) دوسرے یہ کہ یہ ذمہ داری کب ملتی ہے؟

دونوں باتیں اللہ تعالیٰ نے واضح اور دوٹوک الفاظ میں بیان فرمائی ہیں، پہلی بات یہ بیان فرمائی ہے کہ علما کی ذمہ داری، ائمہ کی ذمہ داری، دینی تحریکات سے وابستہ افراد کی ذمہ داری، دینی خدام کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان ہدایت کا کام کرتے رہیں، اس کے سوا ان کی کوئی ذمہ داری نہیں، بہ حیثیتِ ذمہ داری کے ان کا ایک ہی ایک کام ہے، وہ یہ کہ وہ لوگوں کو راہِ ہدایت پر لانے کی ہر ممکن کوشش وفکر کریں اور اس کی جدوجہد وتدبیر کریں۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اسی ذمہ داری کو بتایا ہے:

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ

الْمُنْكَرِ﴾ [آل عمران: ۱۱۰]

(تم بہترین امت ہو، جو لوگوں کے (نفع) لیے بنائی گئی ہو، تم ''امر بالمعروف'' اور ''نہی عن المنکر'' کرتے ہو)

لوگوں کے نفع کے بہت سے کام ہیں؛ مگر بہ حیثیت امت کے جو کام اور جو ذمہ داری دی گئی ہے، وہ ''امر بالمعروف'' اور ''نہی عن المنکر'' ہے، اسی کا نام ہدایت ہے

لہٰذا علما کو سمجھ لینا ہے کہ ہم اسی لیے پیدا ہوئے ہیں کہ لوگوں کو ''امر بالمعروف'' کے ذریعے بھی اور ''نہی عن المنکر'' کے ذریعے بھی ہدایت کا راستہ بتاتے رہیں۔ معلوم ہوا کہ اگر کوئی مولانا صاحب تجارت کی منڈی میں بیٹھ جائیں یا کسی صنعت گری کے کام میں لگ جائیں یا کسی دنیوی کام کی ملازمت میں جڑ جائیں، تو ہدایت کا کام ان سے نہیں ہوگا۔ تجارت کے لیے اللہ نے علما کو پیدا نہیں کیا ہے، صنعت گری کے لیے اللہ نے ان کو پیدا نہیں کیا، اسی طرح دنیا کے دوسرے کام بھی علما کے نہیں ہیں، ان کا اصل کام، ان کی حقیقی ذمہ داری، تو ''یھدون بأمرنا'' (ہمارے حکم سے ہدایت) کرتے رہنا ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب لدھیانوی رَحِمَہُ اللہُ پاکستان کے بہت بڑے عالم ہیں، انہوں نے ''احسن الفتاوی'' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ سماجی کام میں لگ جانا عالم کے لیے جائز نہیں ہے، جیسے لوگوں کو پانی پلانا، سڑکوں کو درست کرنا وغیرہ۔ اس لیے کہ یہ کام تو دوسرے لوگ بھی کر سکتے ہیں، کوئی اَن پڑھ بھی کر سکتا ہے، دنیا کی تعلیم والا بھی کر سکتا ہے، علما کی جو ذمہ داری ہے، وہ بہت اعلیٰ ہے۔

آیت میں توجہ طلب اہم نکتہ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ''یھدون بأمرنا'' (یعنی وہ علما ہدایت کا کام

کرتے ہیں) فرمایا؛"یدعون بأمرنا" (دعوت کا کام کرتے ہیں) نہیں فرمایا؛ اس لیے کہ دعوت ذریعہ ہے، ہدایت مقصود ہے۔ دعوت کا مقصد بھی ہدایت تک پہنچنا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے مقصد بتایا ذریعہ نہیں بتایا، ہدایت کے وسائل اور ذرائع کچھ بھی ہو سکتے ہیں، وسائل و ذرائع متعین نہیں ہوا کرتے، مقصود متعین ہوتا ہے۔

مدرسہ ہدایت کے کام کا ذریعہ ہے، دعوت و تبلیغ کی تحریک ہدایت کا ذریعہ ہے، تصنیف و تالیف ہدایت کا ذریعہ ہے، جمعہ کے بیانات ہدایت کا ذریعہ ہیں، خانقاہ ہدایت کا ذریعہ ہے، تصوف و سلوک کے طرق ہدایت کا ذریعہ ہیں، قرآن کریم کی تفسیر کرنا ہدایت کا ذریعہ ہے، یہ اور ان کے علاوہ بے شمار ذرائع ہیں، طریقے ہیں، انداز ہیں، ان سب کا مقصود ہدایت تک پہنچانا ہے، ان میں سے کسی بھی ذریعے سے آپ ہدایت تک پہنچ سکتے ہیں، ذرائع کی بحث نہیں ہے، مقصد کی بحث ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اے دین کے خادمو! اپنے ذہن میں ہمیشہ یہ رکھو کہ تمہارا مقصود ہدایت کا کام ہے، اس کا ذریعہ کچھ بھی ہو۔

ایک عمدہ مثال

مثال کے طور پر آپ حج کرنا چاہتے ہیں، حج کو جانے کا ایک ذریعہ ہوائی جہاز ہے اور آج کل اکثر ممالک سے آنے والے یہی ذریعہ اختیار کرتے ہیں اور یہ لوگ ہوائی جہاز سے جدہ تک جا سکتے ہیں، جدہ سے کار یا بس کے ذریعہ مکہ تک پہنچتے ہیں۔ اور ایک ذریعہ بسیں اور کاریں ہیں، متعدد علاقے ایسے ہیں جہاں سے بس یا کار سے حج کا سفر کرنا پڑتا ہے، وہاں آپ کو ہوائی جہاز کی کوئی سہولت نہیں ہے، اسی طرح پانی کا جہاز بھی حج کو جانے کا ایک ذریعہ ہے۔ اسی طرح ایک طریقہ سائیکل کی سواری بھی ہے اور بعض لوگ پیدل بھی حج کے لیے جاتے ہیں اور پہلے دور میں بہت سے

حضرات اکابر نے پیدل حج کیا ہے۔

جب ہم حج کو گئے تھے، تو دیکھا کہ ایک صاحب حج کرنے بہار سے سائیکل پر آئے تھے، انہوں نے سائیکل کے پیچھے ایک بکسا بنالیا تھا، اس میں کھانے پینے کا سامان رکھتے تھے، اور گاؤں گاؤں قریہ قریہ طے کرتے کرتے تقریباً تین یا پانچ سال میں مکہ پہنچے، ہم نے ان کی سائیکل بھی دیکھی، حکومت نے اخباروں میں بھی اس کا اعلان کیا، یہ بھی ایک ذریعہ ہے حج کو جانے کا۔

الغرض! یہ سارے کے سارے وسائل و ذرائع ہیں حج کے سفر کے لیے، اب کوئی ان ذرائع پر بحث کرنے لگے، ہوائی جہاز سے سفر کرنے والا کہنے لگے کہ حج اُسی وقت ہوگا جب سفرِ حج ہوائی جہاز سے ہوگا، بس یا کار سے سفر کرنے والے کہنے لگیں کہ حج کے لیے بس یا کار کا سفر ضروری ہے، ورنہ حج نہ ہوگا، سائیکل سے سفر کرنے والا کہنے لگے کہ حج اسی وقت ہوگا، جب سفرِ حج سائیکل کے ذریعے کیا جائے، تو یہی کہا جائے گا کہ ان لوگوں کو حج کی حقیقت ہی نہیں معلوم، اس لیے سائیکل اور ہوائی جہاز ہی کی بحث ہو رہی ہے، مقصد کی کوئی بحث ہی نہیں۔

یہ ذرائع کی بحث بے کار ہے، فضول ہے، یاد رکھنا چاہیے کہ ذرائع متعین نہیں ہیں، کسی بھی طرح پہنچیں حج میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

بھائیو! یہی حال آج دینی تحریکات کا ہوگیا ہے کہ دینی تحریکات سب اپنی جگہ ضروری ہیں، مدارس ضروری ہیں، جامعات ضروری ہیں، خانقاہیں ضروری ہیں، مشائخ کا سلسلہ ضروری ہے، دعوت و تبلیغ کا کام ضروری ہے، یہ سب ضروری ہیں، لیکن لوگ اب ان ذرائع کی بحث میں پڑ گئے ہیں، کوئی کہتا ہے مدارس ضروری نہیں، کوئی کہتا ہے مشائخ کی ضرورت نہیں، کوئی کہتا ہے خانقاہوں کی ضرورت نہیں،

کوئی کہتا ہے دعوت وتبلیغ کی ضرورت نہیں، سب کا خلاصہ یہ نکلے گا کہ دین ہی کی ضرورت نہیں، لاحول و لا قوة إلا باللّٰه ۔

اسی بحث میں ہم لوگ غلط فہمیوں کا شکار ہو جائیں گے اور ہمارے دل دعوت و ہدایت کے بجائے عداوت و بغاوت کے کام میں مشغول ہو جائیں گے۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے تو ہم کو ہدایت کا کام دیا تھا اور ہم شیطان کے کام میں لگ گئے، اللہ یہ نہیں دیکھیں گے کہ کس ذریعے کو اپنایا تھا، بل کہ یہ دیکھیں گے کہ ہدایت کا کام ہوا یا نہیں، مدرسے کے ذریعے منزل کو پہنچو یا دعوت وتبلیغ کے ذریعہ منزل کو پہنچو، تصوف وسلوک سے پہنچو، دیکھنا یہ نہیں ہے، دیکھنا یہ ہے کہ منزلِ مقصود یعنی ہدایت کا کام ہوا یا نہیں، اگر ہوا، تو ہم صحیح راستے پر ہیں ورنہ نہیں۔ آج کے دور میں اس بات کو سمجھنا انتہائی ضروری ہے، اس قدر ضروری ہے کہ اس کے نہ سمجھنے کی وجہ سے ہمارے درمیان بے شمار اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔

دین اسلام ایک محل ہے، جس کے بہت سے شعبے ہیں

آپ ﷺ جو دین لے کر آئے، وہ ایک معمولی چھوٹا سا کمرہ یا جھونپڑا نہیں ہے، وہ ایک عظیم الشان محل کی طرح ہے، ایک بنگلہ ہے، جس میں بے شمار کمرے ہیں، بہت سارے اس کے ستون ہیں، اس محل میں بے پناہ دولتیں و نعمتیں موجود ہیں۔ یہ سب مل ملا کر دین کہلاتا ہے۔ صرف ایک چیز کا نام پورا دین نہیں ہے۔

یا ایسا سمجھ لیجیے کہ دین کے بہت سے شعبے ہیں، وہ سب مل کر دین کا کام پورا ہوتا ہے۔

چناں چہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ان شعبوں کی جانب اشارہ کیا ہے اور آپ ﷺ کے بعثت کے مقصد کو بتاتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾

[آل عمران: ۱٦۴]

(تحقیق کہ اللہ تعالی نے مؤمنوں پر احسان کیا، جب کہ ان میں ایک رسول انہیں میں سے بھیجا، جو مومنوں کے سامنے تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک کام یہ بتایا "یَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ" کہ وہ لوگوں کے سامنے قرآن کی تلاوت کرتے ہیں یعنی قرآن کی آیات دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی آیات دوسروں تک پہنچانا یہ دعوت ہے، اسی کو تبلیغ کہتے ہیں، اللہ نے ان آیات کے ذریعے جو بھی پیغام دیا، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ بلا کم وکاست دوسروں کو پہنچادیا؛ لیکن آپ کے کاموں میں یہ ایک ہی کام تبلیغ کا نہیں بتایا؛ بل کہ یہ اس کا ایک شعبہ ہے، پورا دین نہیں ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وَيُزَكِّيْهِمْ" کہ وہ نبی لوگوں کا تزکیہ کرتے ہیں، ان کی برائیوں کو نکالتے ہیں، ان کے خبائث کی اصلاح کرتے ہیں، ان کے اندر کی بے دینی کو دور کرتے ہیں، اس فکر میں رہتے ہیں کہ ان کا دل مجلیٰ ہو جائے، مصفیٰ ہو جائے، اس دل کے اندر خدا کی محبت پیدا ہو، اس دل کے اندر خدا کا خوف ہو، اس دل سے دنیا کی محبت نکل جائے، ریا کاری نکل جائے، تکبر نکل جائے وغیرہ۔

معلوم ہوا کہ ظاہر وباطن دونوں کی اصلاح اللہ کے نبی کی ذمہ داری ہے، یہ اسلام کا دوسرا شعبہ ہے، اسی کا نام تزکیۂ نفوس ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا'' **وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ**''، یہ بھی نبی کی ذمہ داری ہے کہ کتاب اللہ کی اور حکمت کی تعلیم دے۔ معلوم ہوا کہ تعلیم بھی اللہ کے نبی کی ذمہ داری ہے، یہ اسلام کا تیسرا شعبہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ آیت قرآن میں تین جگہ ذکر کی ہے، جس سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ نبی کے تینوں کام ضروری ہیں اور سب مل کر دین کی محنت پوری ہوتی ہے اور نبی کے بعد ان کو قیامت تک جاری رکھنا امت کی ذمہ داری ہے۔

دین کے شعبوں میں تفریق نہیں

جب یہ بات سمجھ میں آگئی کہ دین کے کئی شعبے ہیں اور ہر ایک شعبہ نبی کا کام اور اس کی محنت کا محور تھا اور یہ کہ امت کی ذمہ داری یہ ہے کہ نبی کے لائے ہوئے دین کے تمام شعبوں کو جاری وساری رکھے اور ان سب کے لیے محنت کرے، تو غور کیجیے کہ اگر کوئی کہنے لگے: تزکیہ ضروری ہے، تعلیمِ کتاب اللہ ضروری نہیں، یا کہے کہ دعوت الی اللہ کا کام تو ضروری ہے، تلاوت ضروری نہیں ہے یا تعلیم ضروری نہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے اللہ کے نبی کے کاموں میں سے کچھ کاموں کو ضروری سمجھا، کچھ کاموں کو غیر ضروری سمجھا اور ان میں تفریق کر دی، گویا نعوذ باللہ، ہم اللہ کے نبی کی اصلاح کرنے بیٹھ گئے کہ یا رسول اللہ! آپ نے یہ کام کیوں کیا؟ یہ تو ضروری نہیں تھا، **لاحول ولا قوۃ إلا باللّٰہ**۔

ظاہر سی بات ہے کہ یہ بے وقوفی و ناواقفی بھی ہے اور نبی کے ساتھ ایک قسم کا مذاق وتوہین بھی۔

لہٰذا دین داروں کو خاص طور پر یہ اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ دین کے تمام شعبے دین ہی کے شعبے ہیں اور اِس لحاظ سے وہ سب کے سب ضروری ہیں، ان میں

سے کسی کو ضروری اور کسی کو غیر ضروری قرار دینے کا کسی کو حق نہیں ہے۔

قرآن میں دعوت وتبلیغ کے تین اصول

اس کے بعد خدامِ دین کی توجہ ایک اور اہم نکتے کی جانب مبذول کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ جس طرح دین کے مختلف ومتعدد شعبے ہیں، اسی طرح خود دعوت الیٰ اللہ کے بھی کئی شعبے یا یوں کہیے کہ کئی طریقے ہیں اور ان کی طرف قرآن میں واضح اشارے موجود ہیں، ایک جگہ ارشاد ربانی ہے:

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾ [النحل: ۱۲۵]

(آپ اپنے رب کے راستے کی طرف لوگوں کو حکمت کے ساتھ اور خوش اسلوبی سے نصیحت کر کے دعوت دیجیے اور ان سے بحث بھی ایسے طریقے سے کیجیے جو بہترین ہو)

سبیل رب کیا ہے؟

اس آیت میں رب کے راستے کی طرف دعوت دینے کا حکم ہے اور رب کے راستے سے مراد ''صراطِ مستقیم'' ہے، جس میں پوری شریعت آجاتی ہے اور شریعت میں عقائد بھی ہیں، عبادات بھی ہیں، معاشرت کے اصول بھی ہیں، معاملات کے متعلق احکام بھی ہیں، اخلاقیات کے اسباق بھی ہیں، پھر ظاہری احکام بھی اس میں ہیں: اس میں نماز ہے، روزہ ہے، حج ہے، تلاوتِ قرآن ہے، ذکر ہے، علمِ دین کی تحصیل ہے، قربانی ہے، زکوۃ ہے اور ظاہری احکام کے ساتھ ساتھ باطن سے متعلق احکام بھی ہیں: توکل علی اللہ ہے، اخلاص ہے، انابت وخشوع ہے، تواضع ہے، صبر ہے، شکر ہے، خوف وخشیت ہے، فکرِ آخرت وطلبِ آخرت ہے وغیرہ۔

پھر احکام میں وہ احکام بھی ہیں، جن میں ہمیں کسی کام کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جنھیں مامورات کہا جاتا ہے اور وہ احکام بھی ہیں، جن میں کسی کام کے کرنے سے منع کیا گیا ہے اور ایسے کاموں کو منہیات کہتے ہیں۔ جیسے شراب نہ پیو، زنا نہ کرو، جھوٹ نہ بولو، رشوت نہ لو، سودی کاروبار نہ کرو، دھوکہ نہ دو، بے حیائی و بے شرمی کے کام نہ کرو وغیرہ۔

یہ سارے احکامات دین کے اندر ہیں، ظاہری احکامات بھی اور باطنی احکامات بھی، مامورات بھی اور منہیات بھی، عقائد کے بارے میں بھی اور عبادات کے متعلق بھی، معاملات کے بارے میں بھی اور معاشرت سے متعلق بھی، اخلاق کے سلسلے میں بھی اور تہذیب وتمدن کی نسبت سے بھی، ان تمام احکامات پر چلنا صراطِ مستقیم ہے اور یہی رب کا راستہ ہے اور اسی کی طرف دعوت دینے کا حکم ہے۔

دعوت الیٰ اللہ کے اصولی شعبے

پھر دعوت الیٰ اللہ کے تین شعبوں کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے، اس میں دعوت الیٰ اللہ کا کوئی خاص طریقہ متعین نہیں کیا گیا؛ بل کہ دعوت دینے کے کچھ اصولی شعبے بتا دیئے گئے، انہیں کے تحت دعوت کا کام کرنا ہے اور یہ تین اصول بتائے گئے ہیں:

(۱) پہلا اصول یہ ہے کہ دعوت الیٰ اللہ کا کام حکمت کے ساتھ کیا جائے۔ حکمت کیا ہے؟ یہ سمجھ لیں کہ ایک عربی کا ''حکمت'' ہے اور ایک اُردو کا ''حکمت''۔ یعنی عربی میں حکمت کے معنی کچھ اور ہیں؛ مگر لوگ اُردو میں حکمت کے لفظ کا غلط مفہوم سمجھتے ہیں اور عام لوگ اور بعض خاص لوگ حکمت کے لفظ کو بڑی حکمت و چالبازی سے استعمال کرتے ہیں اور یہ تشریح کرتے ہیں کہ حکمت دین کا کام نہ کرنے کا نام

ہے، اصلاح نہ کرنے کا نام ہے، معاشرے میں گناہ ہوتے ہوں، تو خاموش رہنا، زنا کاری ہوتی ہو تو کچھ نہ کہنا، بدعات جاری ہوں، تو جاری رہنے دینا؛ ان لوگوں کے نزدیک حکمت ہے۔ **لا حول ولاقوۃ إلا باللّٰہ ۔**

حال آں کہ علما نے حکمت کے معنی بیان کیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''دلائلِ علمیہ'' کا نام حکمت ہے۔ یعنی علمی دلائل کی روشنی میں دین کی دعوت دو؛ کیوں کہ کچھ لوگ ایسے ہوں گے، جن کے سامنے دلائل پیش کرنا پڑے گا، وہ بغیر دلیل کے نہیں مانیں گے؛ اس لیے ان کو قرآنی دلائل، حدیثی دلائل، عقلی دلائل، نقلی دلائل کے ذریعے دعوت دینا ہے، چوں کہ دلائل مضبوط و مستحکم ہوتے ہیں؛ اس لیے لوگ اسے مانیں گے، ان دلائل کے آگے سرِ تسلیم خم کریں گے۔ یہ اصولِ دعوت وہاں استعمال کیا جائے گا، جہاں پڑھے لکھے، تعلیم یافتہ لوگوں میں بات کرنی ہو، وہ محض سرسری باتوں کو قبول نہیں کریں گے، ان کو دلائل سے قائل کرنا پڑے گا۔

(۲) دوسرا اصول یہ ہے کہ دعوت الی اللہ کا کام موعظت و نصیحت کے ذریعے کیا جائے۔

ہم جانتے ہیں کہ کچھ عام لوگ ہوتے ہیں، ان کو دلائل کی ضرورت نہیں ہوتی، اور نہ وہ دلائل سمجھنے کی اہلیت ہی رکھتے ہیں، یہ سیدھے سادھے لوگ ہوتے ہیں، ایسے لوگوں کو دین کی دعوت دینے کے لیے موعظت والا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

موعظت کیا ہے؟ ترغیب و ترہیب، آخرت کے احوال، قبر کے احوال، جنت و دوزخ کی باتیں، ثواب و عقاب کے تذکرے، یہ ہے موعظتِ حسنہ، لہٰذا عام لوگوں کو دعوتِ دین دینے اور ان کو صراطِ مستقیم پر لگانے کے لیے بہترین وعظ کے ذریعے سمجھایا جائے، ان کو آخرت کی فکر دلائی جائے، اللہ کے سامنے جواب دہی کا خوف دلایا جائے، ان کے سامنے ثواب و عذابِ قبر کا تذکرہ کیا جائے۔ اس نصیحت کے

نتیجے میں وہ اللہ کے دین کی طرف آجائیں گے۔

پہلا جو کام ہے، وہ علما کر سکتے ہیں یا وہ جن کے پاس علم ہے، وہ کر سکتے ہیں؛ اس لیے کہ دلائل جاننے، دلائل سمجھانے، بتانے کے لیے علم کی ضرورت ہے، بغیر علم کے نہیں ہوسکتا؛ مگر دوسرا کام اس کے لیے خاص علم کی ضرورت نہیں، ہر آدمی اس کے ذریعے دعوت دے سکتا ہے، دعوت کا کام صرف علما کے ذمہ نہیں ہے، ہر آدمی کی ذمہ داری ہے۔

(۳) تیسرا اصول یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف دعوت دینے کے لیے مجادلہ کرو، مباحثہ کرو، مناظرہ کرو؛ کیوں کہ کچھ لوگ حق بات قبول کرنے کے بجائے کسی بات پر اڑ جاتے ہیں، وہ دین کی دھجیاں اڑاتے ہیں، کبھی توحید پر کلام کرنا شروع کرتے ہیں، کبھی نبی پر کلام کرنے لگتے ہیں، کبھی قرآن پر نکتہ چینی کرنے لگتے ہیں۔ یا اپنے باطل دین و مذہب کو جھوٹے دلائل و بے تکی باتوں سے ثابت کر کے عوام الناس کو گمراہ کرتے ہیں، توحید کی جگہ شرک، ہدایت کی جگہ ضلالت و گمراہی، نیکی کی جگہ برائی، خوبی کی جگہ بدبختی پھیلاتے ہیں، اس وقت ہمیں خاموش بیٹھنے کا حکم نہیں ہے؛ بل کہ اب حکم دیا گیا ہے کہ ان سے مناظرہ کرتے ہوئے ہم ہمارے دین و مذہب کو، اس کی تعلیمات کو، ہمارے نبی کی سچائی ثابت کریں اور توحید کو ثابت کریں قرآن کی حقانیت کو ثابت کریں اور کفر و شرک بدعت و گمراہی کا پردہ چاک کریں، اس کے لیے ضرورت پڑے، تو الزامی دلائل سے اور ضرورت پڑے، تو عقلی و نقلی دلائل سے کام لیں۔ یہ ہے مناظرہ و مجادلہ جس کو تیسرے اصول کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مباحثہ کیا

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک مرتبہ عیسائی لوگ آئے اور

حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کی ’’ابنیت‘‘ یعنی اللہ کے بیٹے ہونے پر گفتگو کی کہ حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام اللہ کے بیٹے ہیں۔ اللہ کے نبی نے اس کی تردید میں کلام فرمایا اور اسی موقعے پر قرآن کریم کی سورۃ الاخلاص نازل ہوئی، جس میں آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ صاف صاف ان کو بتادیں کہ ’’وہ اللہ ایک ہے، بے نیاز ہے، نہ وہ کسی کا بیٹا ہے، نہ اس کا کوئی بیٹا ہے اور اس کے برابر کوئی نہیں‘‘۔

بیٹا اس کا ہوتا ہے، جو محتاج ہو، جسے سہارے کی ضرورت ہو اور بیٹا ہونا دراصل عیب ہے، مگر ہمیں وہ عیب نظر نہیں آتا؛ کیوں کہ انسان میں بہت عیوب ہیں، ان ہی عیوب میں یہ بھی ایک ہے، جیسے کالے پر چار داغ اور لگ جائیں تو کیا فرق پڑتا ہے؟ مگر اللہ کسی کا محتاج نہیں، اس میں کوئی عیب نہیں، اسے سہارے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، تو اس کا بیٹا کیوں کر ہوگا؟

الغرض! اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے دلائل کی روشنی میں ان کو لاجواب کیا، مناظرہ کیا، مجادلہ کیا۔ معلوم ہوا کہ یہ بھی ایک طریقہ ہے دعوت الی اللہ کا۔

اسی نبوی طریقے کے مطابق بہت سے علما ہندوؤں، عیسائیوں، قادیانیوں وغیرہ سے مناظرہ کرتے ہیں اور اسلام کی حقانیت اور حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا آخری نبی ہونا ثابت کرتے ہیں۔ اور کبھی بعض گمراہ و باطل فرقوں سے مناظرہ کرتے ہیں اور ان کے باطل نظریات کا بطلان، ان کے خرافاتی مذہب کی دلائل کی روشنی میں گمراہی کو واضح کرتے ہیں۔

داعی کون ہے؟

مذکورہ بالا آیت کی روشنی میں یہ بات بالکل صاف اور واضح ہوگئی کہ جو بھی ان تین اصولوں کے مطابق دعوت دے گا وہ دین کا داعی و مبلغ ہے اور ان تین اصولوں

کے تحت جن کا اس آیت میں ذکر ہوا، ہزاروں شقیں نکلتی ہیں، بے شمار سبیلیں نکل سکتی ہیں، اس میں تدریس ہے، تصنیف ہے، مناظرہ ہے، فتویٰ نویسی ہے، مکاتب کی تعلیم ہے، جمعے کا خطاب ہے، اللہ والوں کی مجالس ہیں، ان کے علاوہ بھی ہزاروں طریقے ہو سکتے ہیں، ان میں سے جس طریقے سے بھی دعوت دے گا، وہ دینِ اسلام کا داعی کہلائے گا۔

اگر کوئی مناظرے کو دعوت الی اللہ تسلیم نہ کرے، اسی طرح کوئی دلائلِ علمیہ کے ذریعے دعوت دینے کو دعوت میں شامل نہ کرے، تو وہ قرآن کے خلاف بول رہا ہے، حدیث کے خلاف بول رہا ہے، میں اس لیے یہ بتا رہا ہوں کہ بعض لوگ مناظرے کو دعوت کا کام نہیں سمجھتے، تدریس کو دعوت کا کام نہیں سمجھتے، تصنیف کو دعوت کا کام نہیں سمجھتے، جمعے کے خطبات کو دعوت کا کام نہیں سمجھتے، مکتب میں قرآن پڑھانے کو دعوت کا کام نہیں سمجھتے، قرآن کی تفسیر اور حدیث کے درس کو دعوت کا کام نہیں سمجھتے۔

یاد رکھو! کہ یہ بہت بڑی غلط فہمی کی بات ہے اور ان غلط فہمیوں کے نتیجے میں کبھی علما سے بدظنی کے بدترین مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں، کبھی اکابرین سے بدظنی کرتے ہیں، کبھی مدارس سے بدظن ہو جاتے ہیں، کبھی مناظرین سے بدظنی پیدا کر لی جاتی ہے اور بھی بے شمار لوگ جو مختلف جگہ مختلف انداز سے دینی خدمت انجام دے رہے ہیں، ان سے بدظنی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سارے لوگ دین کا کوئی کام نہیں کر رہے ہیں۔

اللہ کے بندو! یہ سارے کام نہیں ہوں گے، تو لوگ آپ کے دین پر حملہ کر دیں گے، اگر مدارس میں قرآن حفظ نہ کرایا جائے، تو قرآن کی حفاظت کیسے ہوگی، حدیث کا درس نہ ہوگا، تو حدیث کی حفاظت کون کرے گا؟ علما لوگوں کو فتویٰ نہ دیں

گے، تو دوسرا کون یہ فتوے کا کام کرے گا؟ حفاظ کہاں سے تیار ہوں گے؟ علما کہاں سے بنیں گے؟ محدث و شیخ الحدیث کہاں سے لائیں گے؟ مناظرہ ومجادلہ نہ ہوگا، تو ادیانِ باطلہ اور فرق ضالہ کی تشکیکات وتلبیسات کا کون جواب دے گا؟ اور اگر جواب نہ دیا جائے گا، تو خود اُمت کے لوگ ان فتنوں سے کیسے بچ سکیں گے؟

لہٰذا ان نظریات کی اصلاح کی ضرورت ہے کہ یہ سارے دینی و دعوتی شعبے و کام دین کے و دعوت کے کام نہیں ہیں، یہ انتہائی درجے کی غلط فہمی ہے، جس کی اصلاح بہت ضروری ہے؛ ورنہ ہوسکتا ہے کہ لوگ دین کے نام پر دین کے خلاف کام کرتے چلے جائیں، جیسا کہ ابھی میں نے کہا کہ قرآن تو مناظرے کو دین کی ایک شق قرار دیتا ہے اور لوگ اسے دین نہیں سمجھتے تو یہ بے دینی ہے۔

ہر مسجد میں دین کا کام ہوتا ہے

مجھے بڑا افسوس ہوا کہ ایک مرتبہ ایک صاحب ہمارے مدرسہ میں اپنے بچے کا داخلہ کروانے آئے، داخلے کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد جاتے ہوئے ملاقات کی غرض سے میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ: ''ہمارے علاقے میں بہت مسجدیں ہیں، مگر دین کا کام صرف ایک مسجد میں ہوتا ہے''۔ یہ سن کر مجھے بڑا تعجب ہوا۔ میں نے ان سے کہا کہ کیا بات ہے؟ کیا مسجدوں میں تالے لگے ہوئے ہیں؟ مسجد میں نمازیں نہیں ہوتیں؟ جمعے کا خطبہ نہیں ہوتا، مکتب کا نظام نہیں ہے؟ کہنے لگے: حضرت! سب کچھ ہے مگر دین کا کام نہیں ہے۔

اب آپ خود فیصلہ کرلیں کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں، کیا یہ بات حق ہے یا باطل ہے؟ غلط ہے یا صحیح ہے؟ اللہ حفاظت فرمائے۔ گویا ان کے نزدیک پنج وقتہ نمازیں بھی دین نہیں ہیں، عالم کے جمعے کا وعظ بھی دین نہیں ہے، مدرسے و مکتب میں قرآن

وشریعت کی تعلیم جو ہوتی ہے وہ بھی دین میں داخل نہیں۔اب اس کو کیا کہیں گے؟ کیا یہ قابلِ اصلاح باتیں نہیں ہیں؟ بسا اوقات ایسے نظریات سے دین چلا جاتا ہے، ایمان ختم ہو جاتا ہے۔

اس لیے تمام دین کے کاموں کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں، ساری خدمات کو دین کا کام ہی سمجھیں، سب کو اپنا رفیق سمجھیں، فریق نہ سمجھیں، فریق سمجھیں گے، تو شیطان دل میں یہ خیال ڈالے گا کہ میں بڑا ہوں، میں ہی سب کچھ کر رہا ہوں، دوسرا کچھ نہیں کر رہا ہے۔یہی دراصل تکبر ہے، عُجب ہے۔اللہ ہماری حفاظت فرمائے۔

حضرت ابرارالحق صاحب رحمہ اللہ کی قیمتی نصیحت۔ایک واقعہ

مجھے ایک واقعہ یاد آیا، ایک مرتبہ حضرت شاہ ابرارالحق صاحب رحمہ اللہ بنگلور تشریف لائے، بنگلور میں حضرت کے ایک مرید تھے، ان کی بسکٹ بنانے کی فیکٹری (FACTORY) تھی، ''آزاد بسکٹ'' کے نام سے۔وہ حضرت والا کو اپنی فیکٹری دکھانے لے گئے، فیکٹری میں مختلف لوگ الگ الگ کاموں میں مصروف تھے۔ایک بہت بڑی مشین بھی تھی، مشین کے کئی اجزا تھے، ہر ہر جز پر لوگ موجود ہیں، کوئی آٹا ڈالتا ہے، کوئی پانی ڈالتا ہے، کوئی پیکنگ (PACKING) کر رہا ہے، کوئی اور کچھ کر رہا ہے، فیکٹری کے مالک حضرت والا کو ہر ایک کی تفصیلات بتا رہے تھے، پھر جب معائنہ سے فارغ ہو گئے، تو حضرت والا ان کے دفتر میں ایک جگہ کرسی پر بیٹھے اور اپنے معمول کے مطابق دین کے بارے میں کچھ فرمانے لگے۔

فرمایا: ''ابھی ہم لوگوں نے فیکٹری کا معائنہ کیا، یہاں بہت سارے لوگ الگ الگ کاموں پر مامور ہیں اور ہر آدمی ایک دوسرے کو اپنا معاون سمجھ رہا ہے، ہر آدمی یہ سمجھ رہا ہے کہ میں جہاں کھڑا ہوا ہوں وہاں کھڑا ہونا ضروری، دوسرا آدمی جہاں کھڑا

ہوا ہے، وہاں اس کا ہونا ضروری، تیسرا آدمی جو کام کررہا ہے، وہ کام بھی ضروری ہے، یہاں جتنے لوگ ہیں، جو بھی کررہے ہیں، سب ضروری ہیں، کوئی ذرا بھی اِدھر اُدھر ہوگا، تو کام نہیں ہوگا، نہ مشین ٹھیک چلے گی، نہ اس سے ٹھیک طور پر بسکیٹ تیار ہوں گے۔

پھر فرمایا کہ اسی طرح دین کے مختلف شعبے، مختلف طریقے اور انداز ہیں، سب اپنی اپنی جگہ ضروری ہیں اور سب کا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ معاون بن کر کام کرنا ضروری ہے، ورنہ دین کا کام بھی کما حقہ نہیں ہوسکتا''۔

سمجھنے کے لیے کتنی بہترین مثال ہے؟!! کتنی عمدہ مثال ہے؟! مدرسے والے سمجھیں کہ مدرسے میں جو پروڈکشن (PRODUCTION) تیار ہورہا ہے، اسے باہر لے جانے والے دعوت وتبلیغ والے ہیں، جیسے بسکٹ تیار ہونے کے بعد کوئی باہر لے جاکر فروخت کرتا ہے، اسی طرح تبلیغ والے قرآن وحدیث کی باتیں گھر گھر پہنچارہے ہیں، مدارس میں قرآن پڑھایا جارہا ہے، حدیث پڑھائی جارہی ہے، مدارس سے یہ پروڈکشن تیار ہوتا ہے، تبلیغ والے یہ سمجھیں کہ اگر مدارس سے یہ پروڈیکشن تیار نہ ہوتو ہم باہر کیا لے کر جائیں گے؟ قرآن وحدیث کے احکامات و فرامین، ان کے حقائق و معارف ہی تو ہیں، جس کو لوگوں میں پیش کرنا اور ان کی جانب لوگوں کو دعوت دینا ہے، اگر مدارس ان کی تعلیم و تحقیق کرکے ان کی حفاظت نہ کریں گے، تو پھر ہم کیا لے جائیں گے؟ نیز دعوت کے کسی بھی طریق واصول پر لگا ہوا شخص بھی ہمارا معاون ہے، مدارس بھی اسی دعوتی کام میں لگے ہیں، علما جو جگہ جگہ بیانات کرتے اور علمی گفتگو کرتے ہوئے علمی دلائل بیان کرکے پڑھے لکھے اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو دین سمجھاتے اور اس کی دعوت دیتے ہیں، یہ بھی وہی کام ہے۔ مشائخ عظام جو احکامِ باطنی کی جانب لوگوں کو متوجہ کرتے ہیں، یہ بھی صراطِ

مستقیم اور سبیلِ رب ہی کی جانب دعوت دیتے ہیں، اگر کوئی صبر وشکر کا بیان کرتا ہے، توکل علی اللہ واعتماد علی اللہ کا درس دیتا ہے، اگر کوئی تواضع کی تعلیم دیتا ہے، اگر تکبر کی مذمت قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح کرتا ہے تو کیا یہ سبیلِ رب کی دعوت نہیں ہے؟ کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ دین ودعوت کا کام نہیں ہے؟

اگر ایک عالم جمعے کے خطبے میں یا کسی اور وعظ کی محفل میں لوگوں کو قرآن پڑھنے، اس کا علم حاصل کرنے، اس پر عمل کرنے کی ترغیب دیتا اور ان سے روگردانی پر وعیدیں بیان کرتا ہو، تو کیا یہ دعوت کے کام میں شامل نہیں ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ سب کے سب اسی دعوت الیٰ اللہ کے کام کے کُل پرزے ہیں، اسی کے ارکان ہیں، اسی کے مختلف حصوں واجزا پر کام کر رہے ہیں؛ لہٰذا یہ سب کے سب ایک دوسرے کے معاون ہیں۔

حضرت ابرار الحق صاحب رحمہ اللہ کا ملفوظ اور اس کی تشریح

مجھے میرے شیخ حضرت ہردوئی رحمہ اللہ کی ایک بات یاد آ گئی۔ فرمایا کہ ”مدارس سے وجودِ اعمال ہوتا ہے، دعوت وتبلیغ سے وجودِ اعمال ہوتا ہے اور تزکیے سے قبولِ اعمال ہوتا ہے“۔ میں اس میں ذرا سی ترمیم کر کے کہتا ہوں (اور ترمیم کا حق ہوتا ہے، تحریف کا حق نہیں ہوتا) کہ ”مدارس سے وجودِ اعمال ہوتا ہے، دعوت وتبلیغ سے ظہورِ اعمال ہوتا ہے اور تزکیے سے قبولِ اعمال ہوتا ہے“۔

اس لیے کہ مدرسے بھی ہدایت کا کام کرتا ہے، مدرسے میں قرآن پڑھایا جاتا ہے حدیث پڑھائی جاتی ہے، فقہ پڑھائی جاتی ہے، دین سمجھایا جاتا ہے، حافظِ قرآن بنایا جاتا ہے، محدثین، مفسرین، فقہا، علما، مفتیان انہیں مدارس سے تیار ہوتے ہیں، اگر یہ مدارس نہ ہوں، تو قرآن کی حفاظت کیسے ہوگی؟ امت کو شرعی مسائل میں

کون رہبری کرے گا؟ حلال وحرام، جائز وناجائز سے امت کوکون آگاہ کرے گا؟ مدارس نہ ہوں، تو دنیا سے علم ختم ہوجائے گا اور جب علم اور علماء ختم ہوجائیں گے، تو جاہل لوگ مفتی بن کر اُمت کو مسائل بتائیں گے، اس طرح وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اورلوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔

معلوم ہوا کہ مدارس ہدایت پھیلانے کا بہت بڑا ذریعہ ہیں، مدارس کی شکل میں بھی ہدایت کا کام ہوسکتا ہے، جامعات کی شکل میں بھی ہدایت کا کام ہوسکتا ہے۔ یہ وجودِ اعمال ہورہا ہے۔

اور دعوت وتبلیغ سے اعمال کا ظہور ہورہا ہے، مساجد بھر رہی ہیں، نمازیوں سے معمور ہورہی ہیں، اجتماعات ہورہے ہیں، لاکھوں انسان جُڑ رہے ہیں، مگر مدارس سے وجودِ اعمال اور دعوت وتبلیغ سے ظہورِ اعمال، قبول اس وقت ہوں گے جب دل کی صفائی ہوجائے گی، اس میں اخلاص پیدا ہوجائے گا، اس میں تقویٰ آجائے گا، تواضع پیدا ہوجائے گی، تکبر ٹوٹ جائے گا۔

اور یہ سب کو معلوم ہے کہ دل کی صفائی مشائخ کی خانقاہوں سے ہوگی، اگر دل کی صفائی نہ ہوئی، تو نماز پڑھنے والا یہ سمجھے گا کہ میں کتنا بہترین انسان ہوگیا ہوں؟! تہجد گذار سمجھے گا کہ میرے سے بڑا کوئی نہیں، تو یاد رکھیے کہ اللہ کی نظر میں اس سے گھٹیا کوئی انسان نہیں، کیوں؟ اس لیے کہ دل کی صفائی نہیں ہوئی، دل میں تکبر کی بیماری پیدا ہوگئی، عُجب وخود پسندی کا روگ پیدا ہوگیا ہے، دل میں شیطانیت کا عُنصر پیدا ہوگیا ہے، یہ وہی شیطانیت ہے، جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے کہ شیطان نے کہا تھا ''أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ'' (میں آدم سے بہتر ہوں)۔

غور کیا جائے کہ اگر دعوت وتبلیغ والا، مدرسے والا، ذکر والا، تہجد والا ان دینی کاموں کے ساتھ روزانہ تھوڑا ''أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ'' کا زہر بھی پیتا رہے، تو اس کا کیا

حال ہوگا؟ تبلیغ بے کار، تدریس بے کار، تصنیف بے کار، ذکر بے کار، تہجد بے کار، سب ضائع ہو جائے گا۔

معلوم ہوا کہ مدرس کے لیے، مفتی کے لیے، محدث کے لیے، مفسر کے لیے معلِم کے لیے، متعلِم کے لیے، دعوت و تبلیغ میں لگے ہوئے افراد کے لیے دل کی اصلاح ضروری ہے، دل کی اصلاح کے بغیر اعمال قبول نہیں ہوں گے۔

دین پر چلنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت

دین پر چلنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک تو علم کی ضرورت ہوتی ہے کہ قرآن کیا کہتا ہے؟ اللہ کے نبی کیا کہتے ہیں؟ نماز کیسے پڑھنا ہے؟ زکوۃ کیسے ادا کرنا ہے؟ روزے کے مسائل کیا ہیں؟ اسی طرح فرائض، واجبات، سنن، مستحبات کا علم ہونا ضروری ہے۔ مدارس اس خدمت کو انجام دیتے ہیں، مدارس کا کام علم کو اُجاگر کرنا، علمی تحقیقات کرنا ہے۔

دین پر چلنے کے لیے دوسری چیز علم پر عمل کرنا ہے۔ پڑھ لیا کہ دنیا کی محبت نہیں رکھنا ہے، پڑھ لیا کہ گناہوں سے بچنا ہے، طاعات کو بجالانا ہے؛ لیکن اس کی عملی تربیت کے لیے، اس عملی میدان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے کسی شیخ سے تعلق اور وابستگی ضروری ہے، اس کے بغیر دل کی اصلاح مشکل ہے، نیکی کا جذبہ پیدا کرنا مشکل ہے، نفس کے کیدوں سے واقف ہونا مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ (اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور صادقین کے ساتھ رہو) [التوبة: ۱۱۹]

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم بنگلور کے سفر کے موقعے پر ہمارے مدرسے میں بھی تشریف لائے تھے، آپ نے بیان میں فرمایا کہ حضرت

تھانوی رحمہ اللہ نے اس کا ترجمہ کیا ہے: ''اے لوگو! تم اللہ والوں کے ساتھ رہ پڑو''۔

اللہ والوں کے پاس ایک دو مرتبہ جانا نہیں ہے، بل کہ ان کی خدمت میں پڑے رہنا ہے، جب پڑا رہے گا، تو معرفت سینہ در سینہ منتقل ہوتی ہے، دل کے صالح اثرات منتقل ہوتے ہیں۔

دلوں کی صفائی کے اس کام کو مشائخ انجام دیتے ہیں، جنہوں نے اپنے دلوں کو مجلیٰ کیا، جنہوں نے اس کے لیے مجاہدہ کیا، قلوب کی صفائی کا اہتمام کیا، ان کے قلوب کی صفائی ہمارے قلوب میں منتقل ہوتی ہے۔

مولانا الیاس صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک خانقاہ کی ضرورت

حضرت مولانا الیاس صاحب رحمہ اللہ کا ملفوظ حضرت مولانا شیخ زکریا صاحب رحمہ اللہ نے اپنی ''آپ بیتی'' میں نقل کیا ہے، اسی طرح حضرت مولانا منظور نعمانی رحمہ اللہ نے ''ملفوظات مولانا الیاس صاحب'' میں نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

> ''مجھے جب بھی میوات جانا ہوتا ہے، تو ہمیشہ اہلِ خیر اور ذکر کے مجمع کے ساتھ جاتا ہوں، پھر بھی عمومی اختلاط سے قلب کی حالت اس قدر متغیر ہو جاتی ہے کہ جب تک اعتکاف کے ذریعے اس کو غسل نہ دوں یا چند روز کے لیے سہارنپور یا رائے پور کے خاص مجمع یا ماحول میں جا کر نہ رہوں قلب اپنی حالت پر نہیں آتا۔

(ملفوظات شاہ محمد الیاس: ۶۵)

حضرت مولانا جیسی روحانی و علمی شخصیت کو کسی اور کام کے لیے نہیں، بل کہ تبلیغی

کام کے لیے گشتوں میں جانے کے بعد محسوس ہو رہا ہے کہ قلب کی حالت میں فرق آ گیا ہے، لہٰذا غسلِ اعتکاف اور صحبتِ صالحین سے اس کو ٹھیک کرنا چاہتے ہیں، تو ہمہ وشما کا کیا کہنا؟ کیا ہم جیسے لوگوں کو ان مشائخ سے اور خانقاہی نظام سے وابستہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے؟

نیز آپ نے خانقاہی نظام ومشائخ صوفیا سے جماعتوں کو وابستہ رکھنے کی جد و جہد بھی فرمائی؛ تا کہ وہاں سے بھی فیض پانے کا سلسلہ جاری رہے۔ حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی رحمہ اللہ نے آپ کی سوانح میں حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحب رحمہ اللہ کے ایک خط کا ذکر کیا ہے، جو آپ نے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ کو تحریر فرمایا تھا، اس میں آپ نے لکھا:

”میری ایک پرانی تمنا ہے کہ خاص اصول کے ساتھ مشائخِ طریقت کے یہاں یہ جماعتیں آدابِ خانقاہ کی بجا آوری کرتے خانقاہوں میں فیض اندوز ہوں اور جس میں باضابطہ خاص وقتوں میں حوالی کے گاؤں میں تبلیغ بھی جاری رہے، اس بارے میں ان آنے والوں سے مشاورت کر کے کوئی طرز مقرر فرما رکھیں، یہ بندہ ناچیز بھی اسی ہفتہ بہت زیادہ اغلب ہے کہ چند رُؤسا کے ساتھ حاضر ہو، دیو بند اور تھانہ بھون کا بھی خیال ہے۔“

(مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت: ۱۲۴-۱۲۵)

غور فرمایئے کہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمہ اللہ کی نظر میں مدارس کی اور خانقاہوں کی کتنی اہمیت ہے؟ لیکن افسوس کہ آج بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں خانقاہوں کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت مولانا الیاس صاحب رحمہ اللہ کوئی

معمولی آدمی تھے؟ مجلیٰ تھے، مصفیٰ تھے، ان کے اخلاص کی برکت سے سارے عالم میں ان کی بات پہنچ گئی، اتنے بڑے آدمی ہونے کے باوجود انہوں نے فرمایا: ''مجھے دل کی صفائی کی ضرورت ہے''۔ مولانا بالخصوص دعوت وتبلیغ میں جڑے ہوئے افراد کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ میرے جیسا آدمی بھی جب مشائخ کی خانقاہوں کی ضرورت محسوس کرتا ہے، تو آپ کو اور زیادہ ضرورت ہے، کوئی مستغنی نہیں ہے۔

ہم سب ایک ہیں

ہم سب ایک ہیں، ہم میں کوئی فرق نہیں ہے؛ جیسے ایک اسکول میں مختلف قسم کے لوگ ہوتے ہیں، کوئی سائنس میں ماہر ہوتا ہے، کوئی میاتھس (MATHS) میں ماہر ہے، کوئی سوشیل (SOCIAL) میں ماہر ہے، کوئی اردو پڑھا رہا ہے، کوئی ہندی پڑھا رہا ہے، کوئی کنڑا پڑھا رہا ہے، کسی کو ایک میں مہارت ہے تو دوسرے کو کسی اور فن میں مہارت ہے، اردو والا کنڑا میں ماہر نہیں، ہندی والا انگریزی میں ماہر نہیں؛ لیکن سب اساتذہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ماشاء اللہ میں جو کام نہیں کرسکتا تھا، وہ انہوں نے کر دیا، سب مل جل کر اسکول کو ترقی دے رہے ہیں، سب ایک دوسرے کو رفیق سمجھ رہے ہیں، کوئی کسی کو فریق نہیں سمجھ رہا ہے۔

اسی طرح مدرسے کے اندر کوئی تفسیر میں مہارت رکھتا ہے، کوئی حدیث میں مہارت رکھتا ہے، کوئی فقہ میں، کوئی نحو میں، کوئی صرف میں مہارت رکھتا ہے اور ہر ایک اپنے فن کا ماہر اپنے اپنے فن کی تعلیم دیتا ہے اور اس فن کی خدمت بجالاتا ہے، یہاں کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ میں ہی مدرسے میں پڑھا رہا ہوں، میں ہی استاذ ہوں، دوسرا استاذ، استاذ نہیں یا یہ کہ دوسرے علوم کی کوئی ضرورت نہیں، صرف وہی علم وفن باقی رہے اور پڑھایا جائے جو میرا اپنا فن ہے، نہیں بل کہ ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ ہم

سب مل کر مدرسے کی گاڑی چلا رہے ہیں۔

بھائیو! اسی طرح دین اسلام ایک جامعہ کی طرح ہے، جو پورے عالم میں پھیلا ہوا ہے، اس عالمی جامعہ میں بہت سارے مدارس ہیں، مکاتب ہیں، دینی تحریکات ہیں، تنظیمیں ہیں، خانقاہیں ہیں، دعوت وتبلیغ کی تحریک ہے، یہ سب کے سب ہدایت کا کام کر رہے ہیں۔

لیکن افسوس کہ آج ایک طرف مدرسے والے ہو گئے ہیں، ایک طرف دعوت وتبلیغ والے ہو گئے ہیں، ایک طرف خانقاہ والے ہو گئے ہیں، یہ سب ایک دوسرے کو اپنا فریق سمجھ رہے ہیں، حال آں کہ یہ سب آپس میں رفیق ہیں۔

ہمارے اکابر نے دین کی تین تحریکیں جاری کیں

میں دیوبندی مسلک کا ادنی ترجمان ہوں، ادنی نمائندہ ہوں، مجھے اس پر فخر ہے، مجھے اس پر ناز ہے، اس حیثیت سے آپ کے سامنے یہ واضح کرنا چاہتا ہوں اور یہ بات بڑے اختلافات دیکھنے کے بعد، بڑے حالات دیکھنے کے بعد، بڑی خرابیاں دیکھنے کے بعد، دلوں کی ناپاکیاں دیکھنے کے بعد، بے شمار لوگوں سے ملاقاتوں کے بعد، بہت سے شہروں کا دورہ کرنے کے بعد عرض کر رہا ہوں، وہ یہ ہے کہ ہمارے اکابرِ دیوبند نے دینی خدمات کے تین سلسلے جاری کیے ہیں:

(۱) مدارسِ اسلامیہ کا سلسلہ۔

(۲) خانقاہوں کا سلسلہ۔

(۳) دعوت وتبلیغ کا سلسلہ۔

یہ تینوں تحریکیں ہمارے ہی اکابر کی قائم کردہ وجاری کردہ تحریکیں ہیں، تینوں کی اہمیت پر، ضرورت پر تفصیلی کلام آپ کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔ اب اگر کوئی ان

تین میں تفریق کرتا ہے، کسی ایک کا بھی انکار کرتا ہے، کسی کو ضروری، کسی کو غیر ضروری قرار دیتا ہے، دعوت وتبلیغ کے کام کو کوئی کام نہ سمجھتا ہو، مدارس کو فضول گردانتا ہو، خانقاہوں کو لغو سمجھتا ہو، ایسا شخص گمراہ ہے، وفادار نہیں ہے، ایسا شخص دین کے نام پر بے دینی پھیلا رہا ہے۔

حضرت مولانا یوسف صاحب لدھیانوی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ''دین کے کسی شعبے کا انکار کرنے والا کفر کی سرحد پر پہنچ چکا ہے''

(آپ کے مسائل اوران کا حل ۱۰/۲۵)

لہٰذا اپنے نظریات کو بدلنے کی ضرورت ہے، اپنی فکروں کو بدلنے کی ضرورت ہے، اپنی اصلاح کرانے کی ضرورت ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ایک دوسرے کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے، دین کے ہر شعبہ والے کو اپنا رفیق سمجھنے اور فریق نہ سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

تلاشِ حق
اور
صراطِ مستقیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تلاشِ حق اور صراطِ مستقیم

الحمد للّٰہ و کفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ،أما بعد:

محترم حضرات!

آج کی مجلس میں دو سوالوں کا جواب دینا ہے، پہلا سوال یہ ہے کہ ہمارے دنیا میں آنے کا مقصد کیا ہے؟ اور دوسرا سوال یہ ہے کہ ہماری محنت کا دائرہ کیا ہے؟

سب سے پہلے تو یہ کہ ہمارا مقصد کیا؟ یہ بات ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب تک کسی چیز کا مقصد متعین نہیں ہو جاتا، کام کرنا بےکار ہے، فضول ہے؛ اسی لیے جب مدارس کے اندر کتاب شروع کی جاتی ہے، (کسی بھی فن کی کتاب) تو اساتذہ طلبہ کو یہ بتاتے ہیں کہ کتاب شروع کرنے سے پہلے یہ بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ کتاب پڑھنے کا مقصد کیا ہے؟

اسی طریقے پر سب سے پہلے سوچنا چاہیے کہ ہمارا مقصد کیا ہے؟ قرآن وحدیث میں غور کرنے کے بعد یہ بات صاف طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ مومن بندے کا دنیا میں جینے کا مقصد صرف اور صرف ایک ہے اور وہ ہے اللہ کی رضا اس کے سوا کوئی مقصد نہیں۔

اب دوسرا سوال یہ ہے کہ اللہ کی رضا کو پانے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ ہماری محنت کا دائرہ کیا ہونا چاہیے؟ اس سوال کا صحیح جواب معلوم نہ ہونے کی وجہ سے دنیا میں بہت سی قومیں، بےشمار فرقے گمراہ ہو گئے اور آج تک ہو رہے ہیں؛ اس لیے کہ انہوں نے من مانی طور پر کچھ طریقوں میں، کچھ عجیب وغریب حرکتوں میں

اللہ تعالیٰ کی رضا کو مضمر سمجھا؛ حال آں کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح مقصد کو واضح کر دیا ہے، اسی طرح مقصد کو پانے کے لیے طریقۂ کار بھی متعین کر دیا ہے۔ اور اللہ کی رضا کو پانے کے لیے وہی محنت کارگر ہوگی، جو خود اللہ نے بتائی ہے، ورنہ ناکامی کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

حصولِ مقصد کے لیے گمراہوں کی جاہلانہ حرکتیں

جوگی لوگ اللہ کو پانے کے لیے محنتیں کرتے ہیں، کوئی آدمی ایک پیر پر کھڑا ہوتا ہے، ایک سال گذر گیا، دو سال گذر گئے، بس جناب یوں ہی کھڑا ہوا ہے، ارے کیوں کھڑا ہوا ہے؟ کہتا ہے کہ اللہ کو پانے کے لیے محنت کر رہا ہوں۔

بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے کھانا چھوڑ دیا، پینا چھوڑ دیا، کبھی ڈاڑھی، مونچھ نہیں بناتے، کبھی اچھے کپڑے نہیں پہنتے۔ ہندو لوگوں کے یہاں یہ بڑا سلسلہ رہا ہے اور اب بھی بعض جگہ موجود ہے اور ان ہندوؤں سے پہلے یا ہندوؤں کے بعد (اس کی تحقیق مجھے نہیں) عیسائی مذہب کے اندر بھی یہ بڑا سلسلہ چلا ہے، ان کے مذہب کے اندر بھی بڑے بڑے راہبین پیدا ہوے۔ ''راہبین'' ان لوگوں کو کہا جاتا تھا، جو جنگلوں میں جا کر بیٹھ جاتے تھے، یہ سمجھ کر کہ اِسی راستے سے اللہ کو پانا ہے، نہ بیوی، نہ بچے، نہ دُکان نہ مکان، نہ زیبائش نہ آرائش، نہ ہی کوئی اور چیز، ساری دنیا کو چھوڑ کر کسی جنگل میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں اور وہاں پر مجاہدے میں لگے ہوے ہیں اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس کے ذریعے ہمیں اللہ ملے گا؛ اس کا نام ہے ''رہبانیت''۔

تاریخ میں یہاں تک لکھا ہے کہ عیسائی راہبین میں رہبانیت کا ایک ایسا ذوق پیدا ہو گیا تھا کہ لوگ اپنے بچوں کے لیے نذریں مانتے تھے کہ ہم اپنے بچے کو راہب بنائیں گے اور پھر اس سے آگے تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ان کے یہاں سب سے بڑا

ومقدس راہب وہ سمجھا جاتا تھا، جو کبھی بھی نہایا نہ ہو، پاکی صفائی بالکل نہ کرتا ہو؛ بل کہ یہاں تک یہ ذوق بڑھا کہ پانی کے استعمال کو معیوب سمجھا جانے لگا اور جو راہب پانی استعمال کر لیتا تھا، اس کو سمجھا جاتا تھا کہ یہ تھرڈ کلاس راہب ہے، نا کام راہب ہے، یا کم درجے کا راہب ہے، تو گویا کہ جو جتنا گندہ ہو، وہ اتنا بڑا راہب ومقدس مانا جاتا تھا۔

تاریخ نے یہ بھی ریکارڈ کیا ہے کہ ''سینٹ میکیر لیس اسکندری'' چھ ماہ تک برابر ایک دلدل میں سوتا رہا؛ تا کہ اس کے برہنہ جسم کو زہریلی مکھیاں ڈسیں اور یہ ہمیشہ ایک من لوہے کا وزن اپنے اوپر لادے رہتا تھا۔

ایک مشہور راہب ''یوحنا'' کے متعلق منقول ہے کہ وہ تین سال تک کھڑے ہوئے عبادت کرتا رہا، ایک لمحے کے لیے بھی نہ بیٹھا نہ لیٹا۔

بعض راہب کسی قسم کا لباس استعمال نہیں کرتے تھے، ستر پوشی کا کام اپنے جسم کے بڑے بالوں سے لیتے تھے اور جانوروں کی طرح ہاتھ پیر کے بَل چلتے تھے اور وحشی درندوں کے غاروں، خُشک کنوؤں یا قبرستانوں میں رہتے تھے اور ان کا ایک طبقہ صرف گھاس کھاتا تھا۔

یہ سب کچھ وہ لوگ اس لیے کرتے تھے کہ ان من مانی ومن گھڑت طریقوں میں خدا کی رضا سمجھتے تھے۔

قرآن میں اللہ نے رہبانیت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ﴾[الحدید:۲۷]

(اور جہاں تک رہبانیت کا تعلق ہے، وہ انہوں نے خود ایجاد کر لی تھی، ہم نے اس کو ان کے ذمے واجب نہیں کیا تھا)

ابتداع کے معنی ہیں، خود ہی تراش لینا، خود ہی گھڑ لینا، جس میں اللہ کی طرف سے کوئی ہدایت نہ آئی ہو، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی بات نہ بتائی ہو، اس کا نام ہے ابتداع؛ اسی ''ابتداع'' سے بنا ہے لفظ ''بدعت''۔

اب بتایئے کہ کیا یہ کوئی میدانِ عمل ہے؟ کیا یہ کوئی ایسا طریقۂ کار ہے کہ جس پر آدمی چلے؟ اس طرح یہ لوگ بھٹکتے رہے کہ گول و مقصد تو متعین کر لیا؛ لیکن اس گول و مقصد کو پانے کے لیے غلط راستے کا انتخاب کیا اور اس طرح اللہ کی رضا کو پانے کے بجائے اللہ کے غضب کے مستحق ہو گئے۔

اسی لیے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو ضالین یعنی گمراہ قرار دیا، جو مقصد کو پانے کے لیے چلے تو تھے؛ لیکن راستہ بھٹک گئے۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں: ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ﴾

حدیث میں آتا ہے کہ ''**مغضوب علیھم**'' اللہ نے یہودیوں کو کہا ہے، یہود اللہ کے غضب کا محل بنے اور ضالین اللہ نے عیسائیوں کو کہا ہے، جو راستے سے بھٹک گئے۔

اس لیے میں نے کہا کہ دو چیزیں ضروری ہیں، ایک تو یہ متعین کرو کہ ہمارا مقصد کیا ہے؟ اور دوسرا یہ متعین کرو کہ اس مقصد تک جانے کے لیے راستہ کیا ہے؟

انسان نے اللہ سے راستہ طلب کیا

ایک بزرگ کی بات یاد آ گئی، وہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں بھیجا، جب انسان دنیا میں آیا، تو وہ پریشان ہو گیا؛ اس لیے پریشان ہوا کہ یہاں دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے، نہ یہ مکان اس کا، نہ یہ وطن اس کا، وہ تو جنت سے آیا تھا، جس کی وجہ سے وہ پریشان ہو گیا اور پریشانی کی

وجہ سے وہ رونے لگا اور اللہ سے التجائیں کرنے لگا کہ اے اللہ! میں کہاں آ گیا ہوں؟ مجھے راستہ نہیں معلوم، میں واپس اپنی جگہ کیسے جاؤں؟ چنانچہ اس نے کہا:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ، صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ، غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ﴾

اس میں انسان نے تین باتیں پوچھیں: اے اللہ! صراطِ مستقیم دکھا دیجیے، وہ صراطِ مستقیم (ان لوگوں کا راستہ) جن پر آپ نے انعام نازل فرمایا ہے۔ دوسری بات اس نے کہی: ''ان کا راستہ نہ دکھائیے، جن پر آپ کا غضب نازل ہوا ہے''۔ تیسری بات یہ کہی: ''اے اللہ ان کا راستہ بھی نہ بتائیے، جو راستے سے بھٹک گئے''۔

سوال میں ایک مثبت پہلو پوچھا اور دو منفی باتیں پوچھیں۔ مثبت تو یہ پوچھا کہ اے اللہ! ان کا راستہ ہم کو بتائیے، جن پر آپ کا اکرام ہوا، جن پر آپ کا انعام ہوا، جن پر آپ کا اعزاز ہوا، ان کا راستہ ہم کو بتا دیجیے؛ تا کہ ہم ان کے راستے پر چلیں۔

اور منفی میں دو باتیں یہ پوچھیں کہ دو قسم کے لوگوں کا راستہ ہم کو نہ بتائیے؛ اس لیے کہ وہ دونوں تو بھٹکے ہوئے ہیں، ایک وہ جن پر آپ کا غضب نازل ہوا، دوسرے وہ جو راہ سے بھٹک گئے۔

اللہ نے خود ہی راستہ بتا دیا

اللہ تعالیٰ نے انسان پر رحم فرما کر راستہ بتایا۔ چناں چہ ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ [النسآء: ٦٩]

(اور جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے، وہ ان کے ساتھ ہوں گے،

جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین اور وہ کتنے اچھے ساتھی ہیں)

اس میں یہ بتایا ہے کہ اللہ کا انعام کن بندوں پر نازل ہوا ہے؟ فرمایا: جو آدمی اللہ کی اطاعت کرتا ہے اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرتا ہے، وہ ان لوگوں کے ساتھ جنت میں رہے گا، جن پر اللہ نے انعام نازل کیا اور وہ انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین ہیں۔ نبی کون ہوتے ہیں؟ یہ تو سب کو معلوم ہے، جو اللہ کی طرف سے اللہ کے بندوں تک اللہ کا پیغام لا کر سناتے ہیں، جو ان کے راستہ پر چلتا ہے، وہ صراطِ مستقیم پر چلتا ہے۔

دوسرے ہیں ''صدیقین''۔ ''صدیقین'' کون ہوتے ہیں؟ صدیق کہتے ہیں نبی کی بات کو بے چوں و چراں تسلیم کر لینے والا، نبی نے کہا اور اس نے مان لیا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام ''صدیق'' اسی لیے رکھا گیا کہ انہوں نے نبی کی بات بے چوں و چرا سنتے ہی مان لی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے علاوہ کوئی اور صدیق نہیں ہوئے، صدیقیت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے والے یہ ہیں، ورنہ تو صحابہ میں ہزاروں صحابہ ''صدیقیت'' کے مقام پر فائز تھے اور صرف صحابہ میں نہیں؛ بل کہ بعد کے لوگوں میں بھی صدیقین ہوئے ہیں، ہوتے بھی ہیں، ہوتے بھی رہیں گے۔ تو یہ ہیں صدیقین۔

تیسرے ہیں ''شہدا''۔ شہدا کون ہوتے ہیں؟ شہدا کہتے ہیں اللہ کے لیے شہید ہو جانے والے، اللہ کے دین کی اشاعت اور اللہ کے دین کی حفاظت اور اللہ کے دین کی دعوت اور اللہ کے دین کی تبلیغ میں لگ کر اپنے خون کے آخری قطرے کو

بہادینے والے لوگوں کو''شہدا'' کہا جاتا ہے، ایسے لوگوں کے راستے پر جو چلیں وہ بھی صراطِ مستقیم پر ہیں۔

چوتھے ہیں''صالحین''۔ یعنی نیک لوگ جو نبیوں کے راستہ پر چلتے ہیں، نبیوں کے پیغام پر زندگی کرتے ہیں، ایسے سارے لوگ''صالحین'' کہلاتے ہیں۔

تو خلاصۂ کلام یہ کہ اللہ نے مذکورہ ان چار قسم کے بندوں کو انعام یافتہ قرار دیا ہے، جو بھی ان کے نقشِ قدم پر ہوں گے وہ صراطِ مستقیم پر ہوں گے۔

صراطِ مستقیم، علم اور عشق سے بنتا ہے

اب یہاں تھوڑی دیر کے لیے آپ سوچیں کہ انعام یافتہ چار لوگوں میں وہ کونسی ایسی بات تھی؛ جس کی وجہ سے ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے بھی ہدایت یافتہ ہیں، اور جن دو قسم کے لوگوں کو مغضوب علیہم اور گمراہ کہا گیا ہے ان میں کونسی ایسی برائی تھی جس کی وجہ سے ان کے راستے پر چلنے والے بھی گمراہ ہو جاتے ہیں؟

یہ ایک اہم سوال ہے؛ بل کہ ایک راز ہے، جسے یہ سمجھ میں آجائے، اس کی زندگی بن جائے۔

باتیں تو بہت ہیں، جزئیات تو بہت ہیں، آپ غور کریں،تو ایسی لاکھوں کروڑوں باتیں آپ کو ملیں گی؛ لیکن بنیادی بات دراصل یہ ہے کہ صراطِ مستقیم دو چیزوں سے مل کر بنتا ہے :ایک علم سے بنتا ہے اور دوسرا عشق سے بنتا ہے۔اگر یہ دونوں چیزیں کسی انسان کے اندر اعتدال کے ساتھ پائی جائیں،تو وہ صراطِ مستقیم پر ٹھیک ٹھیک چل سکتا ہے،ان میں سے ایک میں بھی کمی بیشی ہو جائے گی،تو آدمی صراطِ مستقیم پر نہیں چل سکے گا،ڈگمگا جائے گا۔

علم نہیں ہوگا،تو ظاہر سی بات ہے کہ وہ کیسے چلے گا؟اس لیے علم کی ضرورت ہے

اور اگر علم موجود ہے، عشق موجود نہیں تو، اس سے بھی راستہ قطع نہیں ہوتا، جیسے اسے معلوم ہے کہ فلاں جگہ پر فلاں چیز موجود ہے، راستہ بھی اسے معلوم ہے؛ لیکن اگر اس چیز کی محبت اس کے دل میں نہیں ہوگی، تو وہ نہیں چلے گا، چلے گا اس وقت جب دل میں اس کا شوق ہوگا، اس کی رغبت ہوگی۔

اور یہ جو چار قسم کے لوگوں کا ذکر کیا گیا، ان میں یہی خاص کمال ہے کہ ان میں بھی عشق اور علم دونوں چیزیں موجود تھیں، علم و عشق کے راستے پر چل کر یہ صراطِ مستقیم کو بتانے والے ہوگئے۔ اور یہ جو دو قسم کے لوگوں کے بارے میں کہا گیا کہ ان کے راستے پر نہ چلو، ان میں انہیں دو باتوں کی کمی تھی، ایک میں ایک بات کی کمی تھی، تو اور ایک میں ایک بات کی کمی تھی۔

یہودیوں میں عشق کی کمی

یہودی لوگ علم تو رکھتے تھے؛ ان کے پاس بڑی بڑی کتابیں تھی، جید علماء ان کے پاس موجود تھے اور پچھلی کتابوں سے متعلق بھی ان کو بہت معلومات تھیں؛ لیکن عشق موجود نہیں تھا، اللہ کا عشق موجود نہ ہونے کی وجہ سے چال بازی پیدا ہوگئی، چکر مکر پیدا ہوگیا، علم کو انہوں نے ذریعۂ معاش بنالیا، علم کے ذریعہ دھوکہ دہی شروع کردی، علم کے ذریعے لوگوں کو گمراہ کرنا شروع کردیا، علم کے ذریعے غلط راستے تلاش کرلیے، حتیٰ کہ اللہ کی آیات معمولی قیمت پر بیچتے تھے۔

چناں چہ قرآن کریم نے ان کے متعلق فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَناً قَلِيْلاً أُوْلٰئِكَ لاَخَلاَقَ لَهُمْ فِيْ الآخِرَةِ وَلاَيُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلاَ يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلاَ يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ [آل عمران:۷۷]

(جولوگ اللہ سے کیے ہوئے عہد اور اپنی کھائی ہوئی قسموں کا سودا کر کے تھوڑی سی قیمت حاصل کر لیتے ہیں، ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا اور قیامت کے دن نہ اللہ ان سے بات کرے گا، نہ انہیں (رعایت کی نظر) سے دیکھے گا، اور نہ انہیں پاک کرے گا اور ان کا حصہ تو بس انتہائی دردناک عذاب ہوگا)

اس کی تفسیر میں مفسرین رحمہم اللہ لکھتے ہیں کہ یہودی لوگ اپنی طرف سے کچھ لکھتے اور کہتے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور یہ قبیح حرکت معمولی چند ٹکوں اور روپیوں کے لیے کرتے تھے۔

یہاں تک کہ یہودی خود بھی بھٹک گئے اور لوگوں کو بھی بھٹکانا شروع کر دیا؛ اس لیے کہ علم تو ایسی چیز ہے کہ اگر اس کے ساتھ عشق نہ ہو تو بھٹکا تا رہتا ہے۔ یہ لوگ بھی عشق سے خالی تھے؛ اس لیے بھٹکتے اور بھٹکاتے رہے، یہاں تک کہ دنیا میں اللہ نے ان کو ذلیل ورسوا کر دیا، ان کے اوپر ذلت ومسکنت کا ٹھپہ لگا دیا گیا۔

شیطان میں تین ''عین'' تھے، ایک ''عین'' نہیں تھا

ایک عالم وبزرگ کی بات یاد آ گئی، انہوں نے شیطان کے بارے میں فرمایا: اس کے اندر تین عین تھے، ایک عین نہیں تھا۔ علم کا عین بھی تھا، عرفان ومعرفت کا عین بھی تھا اور عمل وعبادت کا عین بھی تھا؛ لیکن عشق کا عین نہیں تھا۔

شیطان بہت بڑا عالم بھی تھا؛ بل کہ بعض تو کہتے ہیں کہ وہ معلِّمِ ملکوت بھی تھا، بعض لوگوں نے کہا کہ وہ لفظ معلِّم نہیں بلکہ معلَّمِ (زبر کے ساتھ) ملکوت تھا یعنی فرشتوں سے علم حاصل کیا ہوا تھا۔ خیر کچھ بھی ہو، خود استاذ تھا، تو بھی عالم تھا اور اگر ان سے سیکھ لیا، تو بھی عالم ہو گیا تھا۔

اور عبادت تو اس نے اتنی کی ،اتنی کی، کہتے ہیں کہ دنیا کا کوئی چپہ ایسا نہیں کہ جہاں اس نے سجدہ نہ کیا ہو، اتنے سجدے، اتنی عبادت کی !!۔

اور اللہ کی پہچان بھی تھی، جس کو عرفان و معرفت کہتے ہیں ، وہ ہمارے اور تمہارے سے زیادہ اللہ کو پہچانتا تھا، آپ کہیں گے کہ یہ تو عجیب بات ہے؟ نہیں! عجیب نہیں ؛ بل کہ واقعی بات ہے، اس کی ایک مثال دیتا ہوں:

دیکھیے ! جب اللہ نے اسے راندۂ درگاہ قرار دے دیا، اللہ نے اس پر لعنت کر کے اسے اپنی بارگاہ سے نکل جانے کا حکم دیا، تو عین اسی موقعے پر جب کہ اللہ کا غضب بھڑک رہا ہے، شیطان اللہ سے دعا کرتا ہے اور عجیب دعا کرتا ہے اور کہتا ہے:

﴿ رَبِّ أَنۡظِرۡنِيۡ إِلىٰ يَوۡمِ يُبۡعَثُوۡنَ ﴾[الأعراف : ۱۴]

(اے میرے پروردگار! مجھے قیامت تک کی مہلت عطا کر دیجیے)

آپ سوچ سکتے ہیں کہ اگر وہ اللہ کی معرفت نہ رکھتا، تو غضبِ خداوندی کے ایسے بھڑکنے کے وقت اتنی عجیب و غریب اور اتنی بھاری دعا وہ کر سکتا تھا؟ نہیں کر سکتا تھا؛ لیکن اسے معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ کا غضب اختیاری غضب ہے، ہم کو جو غصہ آتا ہے، وہ غیر اختیاری ہوتا ہے؛ لیکن اللہ کا غضب اللہ کے کنٹرول میں ہے، اللہ کے اختیار میں ہے، شیطان سمجھتا تھا کہ اللہ کا غضب بھڑک رہا ہے؛ لیکن میں جب خدا سے دعا کروں گا اور دعا کرنا تو عاجزی و انکساری کی بات ہے، تو اللہ کی طرف سے میری مقبولیت ہو جائے گی ۔ یہ راز اسے معلوم تھا اور جب معلوم تھا، تو اللہ کی معرفت کی وجہ سے اسے معلوم تھا۔ تو دیکھیے وہ ہمارے اور آپ سے زیادہ اللہ کو جاننے والا ہوا، یا نہیں ہوا؟

اس لیے وہ بزرگ کہتے ہیں تین عین اس کے اندر موجود تھے، ایک عین غائب

تھا اور وہ عشق کا عین تھا۔

عیسائیوں میں علم کی کمی

یہودیوں کے برخلاف عیسائیوں کے پاس علم نہیں تھا، عشق ہی عشق تھا اور وہ اللہ کے اور حضرتِ عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَامُ کے عشق میں آ گئے اور ان کی محبت میں غلو کرنے لگے، اتنا غلو کیا کہ ان کو خدا کا بیٹا کہنے لگے اور ان کو خدا کا ہم رتبہ قرار دے دیا اور حضرتِ مریمؑ کو ان کے مقام سے بڑھا دیا، اس طرح عشق نے ان کو دوسرے غلط راستہ پر ڈال دیا، علم نہیں تھا، لیکن عشق موجود تھا، اس عشق نے ان کو بھٹکا دیا۔

قرآن کریم میں ہے: ﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى مَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ﴾ [التوبة:۳۰]

(اور یہود نے کہا کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں)

الغرض! یہ دو وجہیں ہوتی ہیں بھٹکنے کی، علم ہو عشق نہ ہو، عشق ہو علم نہ ہو، یا دونوں نہ ہوں، دونوں نہ ہوں تو کیا حال ہوگا؟ ''ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ'' کا مصداق ہوگا۔

اس امت میں عیسائیوں کی نظیر

اللہ کے نبی صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ایک حدیث میں فرمایا:

''لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ شِبْراً بِشِبْرٍ وَذِرَاعاً بِذِرَاعٍ حَتّٰى لَوْ دَخَلُوْا جُحْرَ ضَبٍّ تَبِعْتُمُوْهُمْ. قُلْنَا : يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ! اَلْيَهُوْدُ وَ النَّصَارٰى؟ قَالَ: فَمَنْ؟''

(تم لوگ ضرور تم سے پہلے لوگوں کے نقشِ قدم پر چلو گے یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی آدمی کسی سوراخ میں سے گھس کر نکلا تھا، تو تم میں بھی ایسے لوگ پیدا ہو جائیں گے جو سوراخ میں گھس کر نکلا کریں گے، ہم نے کہا یا رسول اللہ! (پہلے لوگوں سے مراد) یہود و نصاریٰ ہیں؟ آپ نے فرمایا: پھر کون؟)

(بخاری: ٦٨٨٩)

اس حدیث کے مطابق آج بھی یہی سلسلہ چل رہا ہے، کچھ لوگ ہیں، جن کے پاس علم تو ہے، مگر عشق نہیں، کچھ لوگ ہیں، جن کے پاس عشق ہے علم موجود نہیں۔ مُجاوروں کو آپ نے دیکھا ہوگا، صوفیا کے نام پر بڑے عجیب عجیب تماشے کرتے ہوئے نظر آئیں گے، لوگوں کو بھٹکاتے ہیں، خود بھی بھٹکتے ہیں اور نام رکھا ہے تصوف، نام رکھا ہے معرفت، نام رکھا ہے طریقت اور کہتے ہیں کہ شریعت الگ ہے، طریقت الگ ہے۔ معرفت کے نام سے، عشق کے نام سے، اللہ و رسول کی محبت کے نام سے، اولیا کی محبت کے نام سے غلط طریقے پر لوگوں کو چلاتے ہیں۔

یہ لوگ ایسا اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے پاس شریعت کا صحیح علم نہیں ہے، نماز وہ لوگ نہیں پڑھیں گے، روزے وہ نہیں رکھیں گے، حلال وحرام کی تمیز وہ نہیں کریں گے، اچھے اور برے میں فرق نہیں کریں گے اور اسی کا نام انہوں نے سلوک واحسان رکھ دیا ہے اور اسی کا نام انہوں نے تصوف و عشق کا راستہ رکھ دیا ہے۔

اولیاء اللہ کی مزاروں پر آپ جا کر دیکھو، ہزاروں کی تعداد میں آپ کو نظر آئیں گے، شریعت کا وہ علم، جو ہم قرآن وحدیث میں پڑھتے ہیں اور اکابر اولیا، محدثین وفقہا نے ہم کو بتایا ہے اس کا ذرہ برابر علم ان اولیاء اللہ کی مزارات کے پاس بسنے والوں میں آپ کو دکھائی نہیں دے گا۔

عیسائی لوگوں نے جیسے عشق و محبت کے نام سے عیسیٰ علیہ السلام کو بڑھاتے بڑھاتے خدائی کے مقام تک پہنچا دیا، اسی طریقے پر یہ لوگ معرفت و عرفان کے نام سے اولیاء اللہ کو بڑھاتے بڑھاتے ایسا کر دیا؛ گویا ایسا لگتا ہے کہ ان کے نزدیک خدا تو بس یوں ہی بیٹھا ہے، ایک پتلے کی طرح اور جو کچھ کرتے ہیں، وہ سب اولیاء اللہ کرتے ہیں۔ (نعوذ باللّٰہ)

چناں چہ ان کی کتابوں میں بھی ان لوگوں نے لکھا ہے: ''اللہ نے اپنے مخصوص بندوں یعنی اولیاء اللہ کے ہاتھ میں دنیا کی کنجی دے دی ہے (دنیا کے نظام کو ان کے حوالے کر دیا ہے)۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ رزق کا دینا نہ دینا یا زیادہ دینا یا کم دینا، بیماری کا دینا شفا کا دینا اور عزت کا دینا ذلت کا دینا۔ یہ سب کچھ جو بھی دنیا میں ہوتا ہے، ان ہی اولیاء اللہ کے ذریعے ہوتا ہے، اللہ کچھ نہیں کرتا۔ نعوذ باللّٰہ من ذالک.

دیکھو! کہاں سے کہاں گمراہی پہنچ گئی، یہ عشق و معرفت کے نام سے پھیلنے والی گمراہی ہے۔

اِس امت میں یہودیوں کا نمونہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشن گوئی کے مطابق اس امت میں آپ کو یہودیوں کے نقش قدم پر چلنے والے ایسے لوگ بھی ملیں گے، جو عشق و محبت کے راستے کو جانتے بھی نہیں اور جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتے، ہاں علم ہے ان کے پاس، جانکاری ہے، کتابیں لکھتے ہیں، تحقیق کرتے ہیں، ریسرچ (RESEARCH) کے نام سے بڑے بڑے ادارے بھی قائم کرتے ہیں اور بڑی بڑی کتابیں اڈیٹ (EDIT) کر کے شائع بھی کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے؛ لیکن عشق والے

راستے کو بالکل نہیں جانتے، اب وہ لوگ شیطان کی طرح لوگوں کو گمراہ کرنے کا کام کررہے ہیں، حلال کو حرام، حرام کو حلال کرتے ہیں، جیسا زمانہ، جیسے لوگ، جیسے مزاج ویسے ویسے دین کو ڈھال کر پیش کررہے ہیں یہاں تک کہ وہی نمونہ یہ لوگ پیدا کردیتے ہیں، جو نمونہ پہلے زمانے میں یہودیوں نے پیدا کردیا تھا۔

یہودیوں کے متعلق قرآن میں ہے:

﴿يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾

(اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے)

[البقرة: ۷۹]

قرآن وحدیث چوں کہ اللہ کی طرف سے محفوظ ہیں؛ اس لیے موجودہ دور کے گمراہ لوگ ڈائرکٹ (DIRECT) اس میں تو کچھ کر نہیں سکتے، جیسے یہودیوں اور عیسائیوں نے ان کی کتابوں میں کردیا، ویسے ہماری شریعت میں کوئی نہیں کرسکتا؛ لیکن اپنی اپنی جگہ پر لوگوں کے دل ودماغ میں الٹی سیدھی باتیں بٹھانے کی کوشش کرنے والے کوشش کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ امت میں بہت سارے لوگ بھٹکنا شروع کردیتے ہیں۔ الغرض! دونوں قسم کے نمونے حدیث کے مطابق اس امت میں موجود ہیں۔

محض علم، شیطانی تاویلات سکھاتا ہے-ایک واقعہ

لہٰذا ہدایت کا وہ راستہ، جس کو اللہ سے مانگا گیا ہے، وہ ہے جس میں بہ یک وقت علمِ شریعت بھی ہو اور عشق ومحبت بھی۔

کیوں کہ اگر محض علم ہوگا، تو شیطان اسی علم کو گمراہی کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔

حضرت تھانوی رَحِمَهُ اللّٰهُ نے لکھا ہے: ان کے زمانے میں ایک مفتی نے ایک

فتویٰ دیا۔ مسئلے اس کے سامنے یہ آیا تھا کہ ایک داماد کا غلط تعلق اس کی ساس سے ہو گیا ہے اور اس کے عشق میں وہ مبتلا ہو گیا ہے، اس لیے اس سے شادی کرنا چاہتا ہے اور مستفتی نے مفتی صاحب کو پانچ سو روپیے فیس بھی دی اور کہا کہ کسی طرح آپ اسے حلال کر دیجیے۔

حال آں کہ حلال کرنا، حرام کرنا، کسی انسان کے بس میں نہیں ہے، وہ تو اللہ کا کام ہے حتیٰ کہ اللہ کے رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کو بھی یہ اختیار نہیں ہے۔ اللہ نے قرآن میں ارشاد فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَکَ﴾

(اے نبی! جو چیز اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہے، تم اسے کیوں حرام کرتے ہو؟) [التحریم: ۱]

جب نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم بھی نہیں کر سکتے، تو کوئی اور کیسے کر سکتا ہے؟ لیکن بہر حال اس مفتی (جو مفت سے مفتی تھا، افتا سے مفتی نہیں تھا) نے تو اس سے پانچ سو روپے لے لیے اور کہا کہ ٹھیک ہے، میں اس سلسلے میں غور کر کے جواب دوں گا۔

پھر اس نے ایک فتویٰ لکھا کہ فلاں شخص جو فلاں کا داماد ہے، اس کا اس کی ساس کے ساتھ نکاح جائز ہے؛ اس لیے کہ یہ شخص حقیقت میں اس کا داماد اور وہ حقیقت میں اس کی ساس نہیں ہے؛ کیوں کہ جب اس کا نکاح پڑھایا گیا تھا، اس عورت کی بیٹی کے ساتھ، تو اس وقت بغیر توبہ واستغفار کے نکاح پڑھا دیا گیا تھا اور عام طور پر عورتیں دن رات ایسے کلمات بکتی رہتی ہیں، جن سے کفر لازم آتا ہے اور یہ نکاح توبہ اور بغیر ایمان کی تجدید کے پڑھایا گیا تھا؛ اس لیے حقیقت میں ان کا وہ نکاح ہوا ہی نہیں تھا؛ لہٰذا وہ عورت اس کی بیوی نہیں ہوئی اور وہ اس کی ساس بھی نہیں ہوئی، اس

طرح ان کا کوئی رشتہ ہوا ہی نہیں تھا اور اب اگر یہ نکاح کرنا چاہیں، تو نکاح ہو سکتا ہے یہ اس نے فتویٰ دیا۔

دیکھیے! اس نے کہاں سے کہاں تک کی تاویل نکالی اور اس بے وقوف نے یہ نہیں سوچا کہ نکاح ہوا ہو کہ نہ ہوا ہو؛ لیکن حرمتِ مصاہرت تو لازم آ گئی؟ لیکن جیسے کہ کہا جاتا ہے: ''دروغ گورا حافظہ نہ باشد'' (جھوٹے کو حافظہ نہیں ہوتا) کوئی ایک بات بولتا ہے تو کئی باتیں اس کے ذہن سے نکل جاتی ہیں۔

بہر حال! صرف علم کا راستہ بھی کافی نہیں ہوتا؛ بل کہ بہت سارے لوگ صرف علم کے راستے پر چل کر بھٹک جاتے ہیں، اس لیے علم کے ساتھ عشق کا ہونا ضروری ہے۔

شاہ ابرار الحق صاحب رحمہ اللہ کا ایک قیمتی ارشاد

حضرت مولانا حکیم اختر صاحب رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب رحمہ اللہ کے ساتھ ایک مرتبہ کار میں جانا ہوا، دورانِ سفر کار میں پیٹرول ڈلوانے کے لیے پیٹرول بنک گئے، وہاں دیکھا گیا کہ ایک بڑا ٹرک (لاری) بھی پیٹرول ڈلوانے کے لیے پیٹرول بنک پر کھڑا ہے؛ جب کہ ایک بڑا پیٹرول کا ٹینک اس ٹرک پر موجود ہے، پھر بھی وہ پیٹرول ڈلوانے پیٹرول بنک پر آیا ہے۔

یہ دیکھ کر حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ دیکھو! یہ ٹرک خود پیٹرول کا محتاج اس لیے ہوا کہ اوپر لدا ہوا پیٹرول اندر گھسا ہوا نہیں ہے اور گاڑی کے چلنے کے لیے پیٹرول کا اندر داخل ہونا ضروری ہے، ورنہ کام نہیں چلے گا؛ اسی طرح ایک آدمی کے پاس علم تو موجود ہو، کتابیں موجود ہوں، دماغ میں خزانہ موجود ہو، بہت

سارے علوم وفنون اس کے پاس موجود ہوں؛ لیکن یہ سب کا سب اوپر اوپر ہی ہو، زبان پر ہو، لکھنے میں، پڑھنے میں اور دیگر اوپری جگہوں میں ہی محدود ہو، تو یہ علم اس کے لیے کافی نہیں ہوگا، مفید نہیں ہوگا، جب تک کہ وہ علم اندر نہ گھس جائے، دل میں نہ اتر جائے۔

اسی لیے بعض دفعہ بڑے بڑے علما کو بھی اپنے دل کے اندر کسی صاحبِ نسبت کے ذریعے پیٹرول ڈلوانے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ اوپر تو بہت ہے؛ لیکن جب تک وہ اندر نہیں جاتا، کام نہیں بنے گا۔

دیکھیے! اس مثال سے حضرت نے سمجھایا کہ ایک طرف تو علم ہے، وہ تو ٹھیک ہے؛ لیکن اسے اپنے اندر بھی داخل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ عشق کے ذریعے اندر داخل ہوتا ہے؛ اس لیے کہ عشق اندر پیدا ہوتا ہے، اوپر نہیں ہوتا، یہ جب تک اندر نہیں جائے گا، کام نہیں بنے گا۔ جیسے پیٹرول جب تک اندر نہیں جائے گا تب تک گاڑی آگے نہیں بھاگے گی، اسی طرح ایک آدمی کے پاس علم تو بہت ہے؛ لیکن اس کے باوجود نماز نہیں پڑھتا، علم تو بہت موجود ہے؛ لیکن اچھے اور بُرے میں فرق نہیں کرتا، علم تو بہت موجود ہے؛ لیکن حلال اور حرام کے درمیان فرق نہیں کرتا، علم تو بہت موجود ہے؛ لیکن سنتوں کو پامال کرتا چلا جاتا ہے، علم تو بہت موجود ہے؛ لیکن اس کے باوجود آنکھیں بچانے کی قوت نہیں ہے۔ یہ اسی لیے ہوتا ہے کہ اوپر تو پیٹرول کی ٹینک موجود ہے؛ لیکن اندر داخل نہیں کیا ہے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ یہودیوں کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَاراً﴾ [الجمعة: ۵]

(ان کی مثال) اس گدھے کی سی ہے، جو بہت سی کتابیں اٹھائے ہوئے ہو)

گدھے کے اوپر اگر آپ کتابوں کا بوجھ ڈال دیں، تو کیا وہ گدھا عالم بن جائے گا؟ نہیں! اس کو عالم نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح اگر کسی نے بہت ساری کتابیں جمع کر لیں اور بہت ساری کتابیں پڑھ لیں، تو یہ بھی عالم ہونے کے لیے کافی نہیں ہے؛ بل کہ پیٹرول اندر ڈالنے کی ضرورت ہے، اسی کو میں ''عشق'' سے تعبیر کر رہا ہوں کہ وہ علم جب اندر جاتا ہے، تو عشق میں تبدیل ہو جاتا ہے، جب تک وہ اُوپر اُوپر رہے گا، وہ علم رہے گا اور وہ جب اندر چلا جائے گا، تو عشق میں تبدیل ہو جائے گا اور وہ عشق آپ کو لے کر چلے گا، جیسے گاڑی میں پیٹرول ڈالنے کے بعد گاڑی اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو جاتی ہے اور منزل تک ضرور پہنچ کر رہتی ہے اسی طریقے پر یہ بھی، تو یہ دو چیزیں ہیں اور ان دونوں کو جوڑ کر چلنا ہی دراصل صراطِ مستقیم ہے۔

ہمارے اکابر علم و عشق کے جامع تھے

ہمارے بڑوں میں یہی دو صفتیں تھیں، جس کی وجہ سے وہ انعام یافتہ لوگوں میں شامل ہو گئے، ان میں بھرپور عشق بھی تھا، صحیح علم بھی تھا، ہمارے اسلاف کی تاریخ آپ اٹھا کر پڑھیں، تو آپ کو یہی چیز کھلے کھلے طور پر ملے گی، جیسا کہ ہمارے اکابرین میں بے شمار فقہا، مجتہدین، محدثین، مفسرین علما ایسے ملیں گے، جو دونوں راستوں کو لے کر چلتے تھے، دونوں چیزوں کو ساتھ لے کر چلنا ضروری ہے؛ اسی لیے کسی نے فرمایا:

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق

ہر ہوسنا کے نہ داند جام و سنداں باختن

(ایک ہاتھ میں شریعت کا جام، دوسرے ہاتھ میں طریقت کا اہرن ہر عاشق وشائق شریعت وطریقت ساتھ ساتھ لے جانا نہیں جانتا)

ایک ہاتھ میں شریعت کا علم بھی اس کے پاس موجود ہو اور دوسرے ہاتھ میں عشق کا سندان بھی موجود ہو، یہ دونوں چیزوں کو جو لے کر چلتا ہے وہ صحیح راستے پر چلتا ہے۔

حضرت سیدنا جنید بغدادی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے فرمایا: ''جس نے علم حاصل کرنے سے پہلے عشق کا اور تصوف کا راستہ اختیار کیا وہ زندیق ہوگیا اور جو آدمی عشق اور تصوف کو چھوڑ کر صرف علم کے راستے پر چلا وہ بھی کسی کھائی میں جا گرا''۔

امام مالک رَحِمَہُ اللّٰہُ کا قول ہے:

''من تصوف، ولم يتفقه فقد تزندق ، و من تفقه ، ولم يتصوف فقد تفسق ، ومن جمع بينهما فقد تحقق'' (جس نے تصوف حاصل کیا اور علم نہیں سیکھا وہ زندیق ہوا اور جس نے علم حاصل کیا اور تصوف نہیں سیکھا، وہ فاسق ہوا اور جس نے دونوں کو جمع کیا، وہ محقق ہوا) **(إيقاظ الهمم : ٢)**

اس لیے کہ عالم بھی کہیں نہ کہیں بھٹک جائے گا، صرف علم کافی نہیں ہوتا؛ کیوں کہ اس کے ساتھ اس کا نفس لگا ہوا ہے اور نفس کی وجہ سے اس کا علم، پتہ نہیں کیا کیا پٹی پڑھاتا ہے، تاویلات کرنا سکھاتا ہے، سوچ سوچ کر اس کے اندر سے تاویلات نکالنا شروع کر دیتا ہے اور بعض وقت اتنی خطرناک تاویل نکالتا ہے کہ شیطان بھی اس کے سامنے توبہ کر لیتا ہے، اس لیے دونوں ضروری ہیں۔

الغرض! ہمارے تمام اکابرین ایسے ہی تھے کہ اگر ایک ہاتھ میں علمِ شریعت کا پروانہ ہے، تو دوسرے ہاتھ میں عشقِ الٰہی کا پروانہ ہے۔

امامِ اعظم ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللّٰہُ علم و عشق کے جامع تھے

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللّٰہُ کو دیکھیے، ایک طرف ان کے عشق و

محبت کو دیکھیے اور ایک طرف ان کے کمالِ علم پر نظر کیجیے، دن بھر ان کا ایسا گذرتا تھا کہ تحقیق ہو رہی ہے، تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری ہے، مسائل کے بارے میں بحث اور غور و فکر جاری ہے، حضراتِ علما کی ایک جماعت کی جماعت ان کے پاس موجود ہے، جس میں کوئی تفسیر و حدیث کے فن کا ماہر ہے، تو کوئی فنِ فقہ کا ماہر ہے، تو کوئی علمِ عربیت کا ماہر ہے، یہ سارے ماہرین کی جماعت ایک ایک مسئلے پر بحث مباحثے کے بعد امام صاحب کے سامنے اسے پیش کرتی ہے، پھر امام صاحب اس میں بھی کچھ رد و بدل فرمانے کے بعد اسے قطعیت دیتے ہیں۔ اس طرح دن بھر یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے؛ لیکن جب رات ہوتی ہے، تو اللہ کا یہ بندہ اللہ کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ کوئی ستون کھڑا ہے۔

امام اعظم رَحِمَہُ اللہُ کے انتقال کے بعد ایک آدمی نے کسی سے پوچھا کہ مجھے مسجد کا ایک ستون نظر نہیں آ رہا ہے، اس نے کہا کہ بھائی! ستون تو ایسی چیز نہیں کہ وہ کہیں غائب ہو جائے؟ بات دراصل یہ ہے کہ آپ جسے ستون سمجھ رہے ہیں، وہ ستون نہیں؛ بل کہ امام صاحب رَحِمَہُ اللہُ تھے، جو رات رات بھر نماز میں کھڑے رہتے تھے، جنھوں نے چالیس سال تک عشا کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی تھی، ابھی دو چار دن پہلے ان کا انتقال ہو گیا، جس کی وجہ سے وہ ستون آپ کو نظر نہیں آ رہا ہے۔

دیکھیے! ایک طرف یہ خوف و خشیت، تعلق مع اللہ، اللہ سے عشق، اللہ تعالیٰ کی محبت اور ایک طرف علم ہے، تو ایسا علم کہ پوری دنیا آج تک ان کے علم سے استفادہ کر رہی ہے۔ اللہ اکبر!! حال آں کہ لوگوں نے ان کو بدنام کرنے کے لیے کیا کیا نہیں کیا؟ لیکن بھائیو! جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے؟ جس چراغ کو خدا جلائے اس کو کوئی نہیں بجھا سکتا ہے۔

امام اعظم رحمہ اللہ کا خوفِ آخرت

امام صاحب رحمہ اللہ کے خوفِ الٰہی کے بارے میں ان کے ایک شاگرد نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ امام صاحب عشاء کے لیے تشریف لائے، نمازِ عشا میں ''سورۃ الزلزال'' پڑھی گئی، جس میں قیامت کا ذکر ہے۔ امام صاحب نماز ہی میں روتے رہے، روتے رہے۔ نماز کے بعد جب سب نمازی چلے گئے، تو امام صاحب کچھ غور وفکر میں بیٹھ گئے، اپنے آپ میں مستغرق ہوگئے۔ شاگرد کہتے ہیں کہ میں تھوڑی دیر بعد چراغ گل کر کے گھر چلا گیا، پھر جب میں صبح کے وقت اذان سے کچھ پہلے آیا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ امام صاحب اپنی ڈاڑھی پکڑے ہوئے ہیں، زار وقطار رو رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں: اے اللہ! گناہ کرتے کرتے ڈاڑھی سفید ہوگئی، اس سفید ڈاڑھی کی لاج رکھتے ہوئے میرے گناہ معاف فرما دیجیے۔ پھر جب انہوں نے مجھے دیکھ لیا، تو کہنے لگے: ''یہ میری کیفیت وحالت کسی کے سامنے ظاہر نہ کرنا''۔

ان کے شاگرد نے ان کی حیات میں کسی کو نہیں بتایا، ان کی وفات کے بعد بیان کیا، اس طرح یہ واقعہ تاریخ میں آ گیا۔ بھائیو! امام اعظم رحمہ اللہ کے خوف کا حال دیکھیے، خشیت کا منظر دیکھیے۔

اور یہی حال امام مالک کا بھی تھا، امام شافعی کا بھی تھا، امام احمد بن حنبل کا بھی تھا امام بخاری کا بھی تھا، امام مسلم کا بھی تھا، تمام محدثین کا تھا، تمام علما رحمہم اللہ کا تھا۔ جب ایسا خوف ہوگا، ایسا عشق ہوگا اور علم کے ساتھ ہوگا، تو ایسا عشق اور علم دونوں مل کر انسان کو اعتدال کی راہ پر گامزن کرتے ہیں۔

محمد بن کعب القرضی رحمہ اللہ کا حال

اسی طرح محمد بن کعب القرضی رحمہ اللہ ایک مشہور تابعی گزرے ہیں، جو مفسر

بھی تھے، محدث بھی تھے؛ لیکن محدث سے زیادہ مفسر کی حیثیت سے دنیا ان کو جانتی ہے، تفسیر کی کوئی بھی کتاب آپ کھولیں، تو محمد بن کعب القرضی رَحِمَہُ اللہُ کے حوالے سے کوئی نہ کوئی بات آپ کو ضرور ملے گی۔ یہ بڑے تابعی تھے اور بڑے مفسر تھے، اس سے ان کی علمی شان کا اندازہ کریں اور دوسری طرف عشق کا معاملہ یہ تھا، اللہ سے تعلق کا معاملہ یہ تھا کہ اللہ کے سامنے سجدے میں پڑ جاتے، روتے، گڑگڑاتے، کبھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے، تو کبھی نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے اور عجیب بے چینی کا اظہار کرتے، اتنی بے چینی کا اظہار کرتے کہ ایک مرتبہ ان کی ماں نے ان سے کہا کہ بیٹا! اگر میں نے بچپن سے جوانی تک پھر جوانی سے اس عمر تک تجھے پاکیزگی اور عفت مآب زندگی میں نہ دیکھا ہوتا، تو مجھے یہ خیال ہوتا کہ شاید تو نے اپنی زندگی میں کوئی ایسا گناہ کیا ہے، جس کی وجہ سے تو ایسا کر رہا ہے۔

یہ ان کی ماں کا جملہ ہے جو کتابوں میں لکھا ہوا ہے اور میں نے بھی اپنی کتاب ''نفحات العبیر'' میں جہاں ان کا تذکرہ آیا ہے وہاں یہ قول میں نے ذکر کیا ہے۔ غرض اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ: اماں! میں کیسے اطمینان کر سکتا ہوں کہ میری مغفرت ہو ہی جائے گی؟ اس لیے میں بے چین رہتا ہوں اور جب تک مغفرت کا پروانہ ہاتھ نہیں لگے گا، میری بے چینی دور نہ ہوگی۔

تو بھائیو! یہ تھے وہ حضرات جو ایک طرف علمی میدان میں آگے بڑھتے جاتے تھے، تو دوسری طرف اللہ سے عشق کا معاملہ ہوتا تھا اور ان دو کے ذریعے صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جاتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی صراطِ مستقیم پر چلائے۔ آمین

اسلام
میں مکمل داخل
ہوجاو

باسمہٖ تعالیٰ

اسلام میں مکمل داخل ہوجاو

الحمد للّٰہ و کفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ أما بعد:

فأعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿ يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴾

(اے ایمان والو! اسلام میں مکمل داخل ہوجاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو، بلاشبہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے) [البقرۃ:۲۰۸]

محترم بھائیو! اس آیت میں دو مضامین ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں ایک یہ ہے کہ اسلام میں مکمل داخلہ ہونا چاہیے، دوسرا یہ ہے کہ شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلنا چاہیے۔ دونوں میں جوڑ یہ ہے کہ شیطان انسان کو اسلام سے بغاوت پر آمادہ کرتا ہے، یا نہیں تو کم از کم اسلام کی کچھ چیزوں سے باغی و سرکش بنادیتا ہے۔ انسان اسلام سے باغی بن جائے یا اسلام کی کچھ چیزوں سے باغی بن جائے، ہر دو صورت میں وہ شیطان کی اتباع کرتا ہے۔ دونوں شیطان ہی کے کام ہیں، شیطان انسان سے اپنی دشمنی نکالنے کے لیے انسان کو اسلام کا باغی یا اسلام کے بعض احکامات کا باغی بنانے کی کوشش کرتا ہے؛ کیوں کہ وہ انسان ہی کی وجہ سے اللہ کے دربار سے نکالا گیا تھا، آدم کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے وہ نکالا گیا تھا، اس لیے اس نے اللہ تعالیٰ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ انسان کو ضرور گمراہی کی طرف،

جہنم کی طرف لے جانے کی بھرپور کوشش کرے گا۔اس دور سے آج تک وہ اپنی عداوت ودشمنی نکالنے کے لیے آدم کی ذریت کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔

آیت کا شانِ نزول

اس کے بعد یہ بھی سمجھ لیجیے کہ یہ آیت ایک خاص موقعے پر نازل ہوئی، جس کا پس منظر اور شانِ نزول یہ ہے کہ ایک صحابی تھے، جن کا نام تھا عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ، یہ یہودیوں کے بہت بڑے عالم تھے، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اسلام میں داخل ہوگئے اور اسلام پر جمے رہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر بڑا اعتماد تھا، صحابہ میں ان کو ایک امتیازی مقام حاصل تھا۔

ایک مرتبہ ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہودیوں کے مذہب میں اونٹ کا گوشت حرام ہے اور شریعتِ محمدیہ میں اونٹ کا گوشت کھانا ضروری نہیں ہے، بل کہ کھانے کی صرف اجازت ہے، چاہے کھاؤ، چاہے نہ کھاؤ، جیسے دودھ پینا جائز ہے ضروری نہیں، چائے پینا جائز ہے، ضروری نہیں، پینے یا نہ پینے سے آپ کے اسلام میں کوئی فرق نہیں آئے گا، آپ کے ایمان میں کوئی فرق نہیں آئے گا، آپ کے تقوے میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔اسی خیال سے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے یہ سوچا کہ اگر میں عمر بھر اونٹ کا گوشت نہ کھاؤں تو یہودیوں کے مذہب کی بھی رعایت ہو جائے گی اور اسلام میں بھی کچھ نقصان نہیں ہوگا؛ چناں چہ انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ میں آئندہ کبھی اونٹ کا گوشت نہیں کھاؤں گا۔

اسی موقعے پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، جس میں صحابۂ کرام کو اور ساری دنیا کے مسلمانوں کو حکم دیا کہ اسلام میں مکمل داخل ہو جاؤ، یہ کیا طریقہ ہے کہ اسلام کے ساتھ کچھ یہودیت بھی لائی جارہی ہے، اسلام میں غیرِ اسلام کو بھی جگہ دی

جارہی ہے۔ بین بین والی سوچ اسلام میں چلنے والی نہیں ہے، یہ شیطان کی پیروی ہے۔ یہ ہے آیتِ کریمہ کا پس منظر اور خلاصہ۔

اسلام میں غیروں کی مشابہت حرام

اس سے اندازہ ہوا کہ اسلام میں کسی اور مذہب، کسی اور مسلک، کسی اور طریقے کی کوئی گنجائش نہیں ہے؛ حتیٰ کہ اسلام میں غیروں کی تہذیب، ان کے طور طریقے، ان کی مشابہت، ان کے انداز، ان کے تشخصات اختیار کرنے پر بھی پابندی لگائی گئی ہے۔ لباس میں، پوشاک میں، کھانے پینے کے طریقہ میں، اٹھنے بیٹھنے میں، رہن سہن میں، معاشرت میں کسی بھی چیز میں غیروں کے انداز کو اپنانا اسلام میں حرام وناجائز ہے۔

حدیث میں آتا ہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ" (جو آدمی دوسری کسی قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے، ان کے جیسا بنتا ہے، وہ انہیں میں شامل کر دیا جاتا ہے)

(أبو داؤد: ۴۰۳۳)

اسی لیے علمائے کرام نے، مفتیانِ عظام نے غیروں کی خاص خاص چیزوں کو اپنانے، غیروں کے تشخصات اختیار کرنے والے پر کفر کا فتویٰ دیا ہے۔

مثال کے طور پر عیسائیوں کے یہاں زنار (کراس) پہننے کا رواج ہے اور ان کا یہ خاص تشخص وشعار ہے۔ اگر کوئی مسلمان اسے پہنے تو مفتیانِ کرام فتویٰ دیتے ہیں کہ وہ پہننے والا کافر ہے، اگرچہ وہ اللہ کو مانتا ہے، اللہ کے رسول کو مانتا ہے، قرآن کو مانتا ہے، فرشتوں پر بھی اس کا ایمان ہے، آخرت کو بھی تسلیم کرتا ہے؛ لیکن غیروں کا شعار استعمال کرنے کی وجہ سے کافر گردانا جائے گا؛ کیوں کہ وہ ان کا شعار ہے، ان

کی مذہبی رسم ہے، ان کا خصوصی امتیاز ہے۔

اسی طرح کوئی ہندوؤں کا ٹیکا یعنی قشقہ لگائے جو کفار اپنی پیشانیوں پر لگاتے ہیں، تو ہر آدمی اسے ہندو ہی سمجھے گا اور اگر اس کا مسلمان ہونا ہمارے علم میں ہو، تو ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ ہوسکتا ہے کہ اس مسلمان نے اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کرلیا ہو، اس لیے کہ یہ لگانا کفر کی علامت ہے۔

معلوم ہوا کہ عیسائیوں سے کچھ لینا، ہندوؤں سے کچھ لینا، یہودیوں سے کچھ لینا، یہ کوئی اسلام نہیں؛ بل کہ سر کے بالوں سے پیر کے ناخن تک، اوپر سے نیچے تک اسلام کو اپنانے والا ہی مسلمان ہے، پیدائش سے وفات تک؛ ہر شعبہ میں اسلام کو داخل کرنے والا ہی حقیقی مسلمان ہے۔ یہی اسلام اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے، اسی کا حکم مذکورہ آیت کے اندر دیا جارہا ہے۔

کچھ کچھ اسلامی احکامات کو ماننا یہودیانہ روش

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں ایک جگہ یہودیوں سے کہا ہے:

﴿أَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾

(کیا تم کتاب اللہ کے بعض حصے کو مانتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو)

[البقرة:۸۵]

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿كَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ الَّذِيْنَ جَعَلُوْا الْقُرْآنَ عِضِيْنَ﴾

(یہ تنبیہ قرآن عظیم کے ذریعے اسی طرح نازل کی گئی ہے) (جیسے ہم نے ان تفرقہ کرنے والوں پر نازل کی تھی، جنہوں نے (اپنی) پڑھی جانے والی کتاب کے حصے اور ٹکڑے کرلیے تھے) [الحجر: ۹۱]

ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَى أَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقاً كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقاً تَقْتُلُونَ﴾

(پھر یہ آخر کیا معاملہ ہے کہ جب کبھی کوئی رسول تمہارے پاس کوئی ایسی بات لے کر آیا، جو تمہاری نفسانی خواہشات کو پسند نہیں تھی، تو تم اکڑ گئے؛ چناں چہ بعض (انبیا) کو تم نے جھٹلایا اور بعض کو قتل کرتے رہے) [البقرة:۸۷]

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہی بتایا ہے کہ پچھلے یہودیوں کی بدترین عادت یہ تھی کہ وہ کتاب اللہ میں جو احکامات ان کی مرضی کے مطابق ہوتے، اس کو قبول کر لیتے اور جو ان کی مرضی وخواہش کے خلاف ہوتے، اس کا انکار کر دیتے، ان کو رد کر دیتے تھے، جس کی وجہ سے اللہ نے ان پر عذاب نازل کیا۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے بعض احکامات کو ماننا اور بعض کا انکار کرنا یہودیانہ روش ہے اور ایسے لوگ اللہ کی نظر میں عذاب کے مستحق ہیں۔

بھائیو! کیا آج ہم بھی یہودیوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوے جو احکامات اپنی مرضی کے خلاف ہیں، انہیں پسِ پشت نہیں ڈال رہے ہیں؟ ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو معاملات کی دنیا میں شریعت کو بالکل فراموش کر چکے ہیں اور حرام وحلال کی تمیز کھو کر مال جمع کرنے کی فکر کر رہے ہیں؟! کتنے لوگ ہیں، جن کی معاشرتی زندگی جانوروں سے بھی بدتر ہو چکی ہے؟! اگر یہی یہودیانہ روش جاری رہی، تو اللہ نے جس طرح پچھلے یہودیوں پر عذاب نازل کیا، وہ خدا کہیں ہم پر بھی عذاب نازل نہ کر دے، اس لیے غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک اور جگہ اللہ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْناً فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآ خِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ [آل عمران:۸۵]

(جوآدمی دینِ اسلام کو چھوڑ کر کسی اور طریقہ کو دین بنالے، تو وہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور ایسا انسان آخرت میں گھاٹے اور خسارے والوں میں سے ہوگا)

ان ساری آیتوں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اللہ کے نزدیک ہر معاملے میں دین پر چلنا ضروری ہے، یہی اسلام اللہ کو منظور ہے، یہی اسلام اللہ کے نبی کو پسند ہے۔ دین صرف نماز کا نام نہیں، صرف زکاۃ کا نام نہیں، صرف حج کا نام نہیں؛ بل کہ زندگی کے ہر شعبے میں دین ہونا چاہیے، دینِ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے، لائحۂ عمل ہے، ایک کامل دستور ہے۔

اسلام وغیرِ اسلام کا مجموعہ، اسلام نہیں

اگر کوئی آدمی یہ سمجھتا ہو کہ غیرِ اسلام کی چند یا دو چار چیزیں ہی تو ہم نے اسلام میں داخل کی ہیں، بقیہ تو پورا اسلام وہی ہے۔ تو بھائیو! ایسا سمجھنا بہت بڑی غلط فہمی اور جہالت ہے، بسا اوقات غیر اسلام کی ایک دو چیزیں جب اسلام میں داخل کی جاتی ہیں، تو اسلام کو بھی غیر اسلام بنادیتی ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ایک بالٹی پاک دودھ میں پیشاب کے دو قطرے ڈال دے، تو دودھ زیادہ ہونے کے باوجود حکم نجاست کا لگایا جاتا ہے، پاکی کا حکم نہیں لگایا جاتا اور کوئی یہ نہیں کہتا کہ پیشاب کے دو ہی تو قطرے ہیں، اس کا اعتبار کیوں کیا جارہا ہے؟ اگر کوئی کہے گا، تو لوگ اسے بے وقوف سمجھیں گے۔

دوسری مثال یہ ہے کہ حلوہ بنا کر رکھا گیا تھا، ایسا حلوہ کہ اگر بیمار کو کھلاؤ، تو شفا پائے، اگر کمزور کو کھلاؤ، تو قوت مل جائے؛ لیکن اس میں کسی نے ذرا سا زہر ملادیا۔

اب بتاؤ دنیا کا کون عقلمند ایسا ہے جو یہ کہے کہ زہر کا اعتبار مت کرو، وہ تو دو ہی قطرے ہیں، اس لیے یہ حلوے کھالو۔ اگر کوئی یہ فیصلہ کرے، تو اس کی عقل کا ماتم کیا جائے گا اور اس حلوہ کو حلوہ نہیں کہا جائے گا؛ بل کہ زہر کہا جائے گا۔

بالکل اسی طرح بھائیو! اسلام ایک حلوے کی طرح ہے، اس کے اندر بڑی قوت ہے، بڑی طاقت ہے، اتنی طاقت ہے کہ اسلام کا یہ حلوہ اگر کسی کافر کو کھلا دو، تو وہ مومن بن جاتا ہے، کسی کمزور ایمان والے کو کھلا دو، تو اس کے اندر ایمانی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں؛ لیکن اگر اس اسلامی حلوہ میں کفر کا زہر گھول دو، تو اس کی قوت ختم ہو جاتی ہیں، اب وہ اسلام، اسلام نہیں رہتا؛ اس لیے کہ اس میں کفر کا زہر مل گیا ہے ، کفر کی نجاست مل گئی ہے۔ اسی طرح ہمارے عقائد میں کفریہ و شرکیہ عقائد داخل ہو چکے ہوں، تو اسے کھرچ کھرچ کر نکالنے کی ضرورت ہے، ورنہ وہ عقائد ہمارے اسلام کو غیر اسلام بنا دیں گے، ہمارے ایمان کو کفر میں بدل دیں گے۔ اسی طرح ہمارے اعمال میں، عبادات میں، جو غیر اسلامی اعمال داخل ہو چکے ہیں، ان کو بھی نکالنے کی ضرورت ہے، اسی طرح زندگی کے ہر شعبے میں غور کر کے غیر اسلامی چیزوں کو نکالنا بہت ضروری ہے۔

ریاکاری سے اپنی عبادات کو بچائیں

چناں چہ ہمارے اعمال و عبادات میں بھی ایسے بہت سارے غیر اسلامی اعمال داخل ہو چکے ہیں، جن کی وجہ سے ہماری زندگی کی ساری عبادتیں ضائع ہو رہی ہیں؛ لیکن ہمیں اس کا شعور بھی نہیں ہے۔ ان میں سے ایک چیز ہے ریاکاری۔

اگر ہمارے اعمال میں ریاکاری داخل ہو جائے، تو وہ ہمارے اعمال کو برباد کر دیتی ہے؛ چناں چہ حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن ایک ایسے مال دار کو لایا

جائے گا، جس کو اللہ نے دنیا میں بہت سارا مال دیا تھا، اسے نعمتوں کی یاددہانی کرائی جائے گی، چناں چہ وہ پہچانے گا، پھر اس سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اس مال کو کیا کیا؟ وہ کہے گا کہ میں نے ہر اُس راستے میں خرچ کیا، جہاں خرچ کرنا اللہ کو پسند تھا۔ اس سے کہا جائے گا تم نے جھوٹ کہا، تم نے خرچ اس لیے کیا تھا کہ تمھیں سخی کہا جائے، پھر اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ یہی حال عالم کا بھی ہوگا، یہی حال شہید کا ہوگا۔ (مسلم:۴۷)

کوئی بھی عبادت ہو، نماز ہو، روزہ ہو، زکاۃ ہو یا حج ہو، اسی طرح کوئی بھی دینی خدمت ہو: دعوت وتبلیغ ہو، تصنیف وتالیف ہو، وعظ ونصیحت ہو، کسی بھی عمل میں اگر ریاکاری کا غیر اسلامی عمل داخل ہوجائے، تو وہ سب کو ہلاک کردیتا ہے، اس پر کوئی ثواب نہیں ملتا؛ اس لیے کہ ریاکاری ایسی ہی چیز ہے کہ اس کی وجہ سے عبادات اور نمازوں کی روح تباہ ہوجاتی ہے، حال آں کہ نماز کیسی طاقت ور چیز ہے، اس کے ایک ایک رکن میں بڑی طاقت ہے، سجدے میں کتنی طاقت ہے؟ رکوع میں کتنی طاقت ہے؟ قیام وقعود میں کتنی طاقت ہے؟!! تلاوت میں کتنی طاقت ہے؟!! لیکن ریاکاری ساری قوت کو ختم کردیتی ہے۔ اس لیے ہمارے اعمال کو ریاکاری سے بچانے کی ضرورت ہے، ریاکاری ایک غیر اسلامی عمل ہے، میں یہی بتانا چاہتا ہوں کہ اعمال میں اگر غیر اسلامی عمل داخل ہوچکا ہو، تو اسے بھی نکالنے کی فکر کریں ورنہ سارے اعمال ضائع ہوجائیں گے۔

بدعات بھی اعمال کو ضائع کرتے ہیں

اعمال کو ضائع کرنے والی دوسری غیر اسلامی چیز ہے ''بدعت'' ہمارے اعمال کو بدعات سے بچانا بھی ضروری ہے؛ اس لیے کہ بدعات بھی اعمال کو کالعدم

کر دیتے ہیں، بدعات کیا ہیں؟ من مانی چیزوں کا نام بدعات ہے، جن کا کوئی ثبوت شریعتِ محمدی میں نہ ہو، عہد نبوی میں وہ موجود نہ ہو، خیر القرون میں وہ نظر نہ آئیں، نام تو ہو اسلام کا، کام ہو شیطان کا، لیبل تو ہو اسلامی، لیکن اندر سے اسلام کے اعتبار سے بالکل کھوکھلا ہو۔ صورت وشکل کے اعتبار سے بدعات کی شکل اسلامی ہوتی ہے؛ نماز کی شکل ہوتی ہے، ذکر کی شکل ہوتی ہے، دعا کی شکل ہوتی ہے؛ لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ عمل بے حقیقت ہوتا ہے، بدعت اسی کا نام ہے، آج لوگوں نے اپنے اعمال وعبادات میں بے شمار بدعات اور لغویات داخل کر لی ہیں، کسی نے دعا کے نام سے، کسی نے طاق راتوں کے نام سے، کسی نے ذکر کے نام سے، کسی نے جلوس کے نام سے، کسی نے میلاد کے نام سے، کسی نے عرس وقوالی کے نام سے؛ لیکن بھائیو! جس ذکر کو اللہ کے نبی نے پسند نہیں کیا، جس دعاء کو اللہ کے نبی نے پسند نہیں کیا، جس طور طریقے کو اللہ کے نبی نے پسند نہیں کیا، وہ دین نہیں، بد دینی ہے وہ اسلام نہیں، غیر اسلام ہے۔ یہودیوں نے اسلام کو اسی طرح بگاڑا تھا، عیسائیوں نے بھی یہی حرکت کی تھی، اللہ کے نام پر، دین کے نام پر من مانی چیزوں کو داخل کر دیا تھا، یہاں تک کہ گمراہی وضلالت ان کا مقدر بن گئی۔ اللهم احفظنا منه

آج ہم میں سے بھی بہت سے لوگ یہی کر رہے ہیں۔ آج ان چیزوں کو سمجھنا، لوگوں کو بتانا، سمجھانا بہت ضروری ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ اسلام کے نام پر فضولیات انجام دینے لگیں، اللہ کی رضا کی تلاش میں کہیں اللہ کے عذاب کے مستحق نہ ہو جائیں۔ جب تک اعمال کو بدعات سے پاک نہیں کریں گے، ہم مکمل اسلام میں داخل نہیں ہو سکتے۔

خلاصۂ کلام

تمام باتوں کا خلاصہ اور لُبِّ لُباب یہ ہے کہ آج ہمیں کامل مومن بننے کی

ضرورت ہے، ہماری معاشرت بھی مومنانہ ہو، ہمارے معاملات بھی مومنانہ ہوں، ہمارے اخلاق بھی مومنانہ ہوں، عبادات میں بھی ہم مومن و مسلمان ہوں، عقائد میں بھی ہم مسلمان ہوں، مسجد میں بھی مسلمان ہوں، اپنی منڈی میں بھی ہم مسلمان ہوں، بازار کے اندر بھی ہم اللہ تعالیٰ کو فراموش نہ کریں، شادیوں میں بھی اللہ کے قانون کو نہ بھولیں، پیدائش اور وفات کے موقعے پر سنتِ نبوی کا لحاظ ہو، سیاست کے ایوانوں میں بھی شریعت کا خیال ہو، تب ہم حقیقی مسلمان بن سکتے ہیں۔ ورنہ ہم پر علامہ اقبال رَحِمَہُ اللہُ کا یہ شعر صادق آئے گا:

شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلماں نا بود
ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود
وضع میں تم ہو نصاریٰ، تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کہ شرمائیں یہود

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم تمام کو اسلام میں مکمل طور پر داخل ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور زندگی کے ہر شعبے میں شریعت کو نافذ کرنے میں ہماری مدد فرمائے۔

ادب
انسان کو انسان
بناتا ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادب انسان کوانسان بناتا ہے

نحمده ونصلي علىٰ رسوله الكريم أما بعد :

فقد قال النبي صلی اللہ علیہ وسلم " اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ" [البخاری: ۹]

(مسلمان وہ ہے، جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں)

کامل مسلمان کون ہے؟

یہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے، جو بڑی معروف اور بڑی مشہور ہے، اس حدیث میں مسلمان کا مقام بتایا گیا ہے اور حقیقت میں انسان کا مقام بتایا گیا ہے کہ انسان کیسے ہوا کرتے ہیں؟ عام طور پر مسلمان اس آدمی کو لوگ سمجھتے ہیں، جو نماز پڑھتا ہو، زکوٰۃ دیتا ہو، حج پر حج ادا کرتا ہو، ذکر کرتا ہو، تلاوت کرتا ہو، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ساری چیزیں بھی اسلام کی اہم چیزیں اور اہم باتیں ہیں؛ لیکن اس کے باوجود اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: " اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ"

(کامل مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں)

معلوم ہوا کہ ایک آدمی نماز پڑھتا ہو، روزہ بھی رکھتا ہو، تلاوت بھی بہت کرتا ہو اور بھی ساری عبادتیں انجام دیتا ہو؛ لیکن اس کے باوجود اس کے اعمال سے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہو، پریشانی ہوتی ہو، تو اس کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ ابھی حقیقی مسلمان نہیں

ہوا ہے۔ جس کی طرف سے لوگوں کے لیے خیر ہی خیر وجود میں آتا ہو، وہ ہے دراصل کامل مسلمان۔

بزرگ بننا آسان ہے، انسان بننا مشکل

جو آدمی انسان ہوگا اور اس کے اندر انسانیت ہوگی، تو اس کے اعمال سے، اس کے طور طریق سے، اس کے رہن سہن سے، اس کے انداز سے، بات چیت سے، اس کے لب و لہجے سے، تمام چیزوں سے خیر ہی خیر وجود میں آئے گا اور لوگوں کو بھلائی پہونچے گی، کسی کو کوئی اذیت اور تکلیف نہیں پہنچے گی؛ اسی لیے حضرت مولانا حکیم الامت اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ فرمایا کرتے تھے: ”بزرگ بننا بڑا آسان ہے؛ لیکن انسان بننا بڑا مشکل ہے“۔

ایک آدمی بزرگ بن جائے، صوفی بن جائے، ہر وقت ذکر میں، ہر وقت فکر میں اور تلاوت میں، نماز میں اور دیگر اعمال میں، ریاضت میں، مجاہدے میں لگا رہے، تو بزرگ ہو جائے گا؛ لیکن اس کے باوجود اس کے اندر ایسی خامیاں ہوں گی کہ اس کی وجہ سے وہ انسان نہیں کہلائے گا۔

اس لیے انسان بننا بھی انسان کے لیے ضروری ہے، اگر انسان بننا انسان کے لیے ضروری نہیں، تو پھر کیا کتے بلیوں کے لیے ضروری ہوگا؟ اللہ تعالیٰ ہمیں انسان بنائے؛ مگر انسان انسان نہ رہے اور اس کے اندر سے انسانیت ختم ہو جائے، اس کے اندر سے اخلاق ختم ہو جائیں اور وہ جانوروں کی طرح ہو جائے، اسے ہوش ہی نہ رہے کہ میں کیا کر رہا ہوں، کیسا اٹھ رہا ہوں، کیسا بیٹھ رہا ہوں، کیسا بول رہا ہوں، زبان سے کیا الفاظ نکل رہے ہیں اور کس سے کس طرح مجھے بات کرنی چاہیے، کس سے کیسا کلام کرنا چاہیے، کھانے، پینے کا کیا طریقہ ہونا چاہیے اور رہن سہن کا کیا

انداز ہونا چاہیے؟ یہ ساری چیزیں انسانیت سے متعلق ہیں اور ایک انسان جب تک ان ساری چیزوں پر توجہ نہیں کرے گا، دھیان نہیں دے گا، تو وہ ہوسکتا ہے کہ ذکر وفکر کی وجہ سے بزرگ ہو جائے؛ لیکن انسان نہیں ہوسکتا۔

نمازی بن گیا مگر انسان نہ بن سکا- ایک واقعہ

حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھول پوری رَحِمَہُ اللہُ نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ آپؒ کی مسجد میں ایک نوجوان ہمیشہ ذکر وفکر اور عبادت میں مشغول رہتا تھا، آپؒ اس کو دیکھتے کہ وہ کبھی بڑے عاجزانہ انداز سے اللہ کے سامنے دعا میں مشغول ہے، کبھی رو رہا ہے، گڑگڑا رہا ہے، اللہ کے سامنے عاجزی کر رہا ہے اور ایسا اس کا انداز ہے کہ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھول پوری رَحِمَہُ اللہُ کہتے ہیں کہ اسے دیکھ کر مجھے اس پر رشک وحسرت ہوتی۔

فرمایا کہ ایک مرتبہ میں ایک طرف کو بیٹھے ہوے اس کو دیکھ رہا تھا، اتنے میں ایک بوڑھے آدمی مسجد میں داخل ہوے اور شاید وہ نابینا تھے یا آنکھیں ان کی کمزور تھیں، جس کی وجہ سے ان کی نظر میں وہ نوجوان نہیں آیا، تو ان کا پیر اُس نوجوان کو لگ گیا اور اس سے ٹکر ہوگئی، جوں ہی ان کا پیر اس کو لگا، وہ اپنی عبادت ودعا سب بھول گیا اور بوڑھے میاں کو اٹھ کر گالیاں دینے لگا، کہنے لگا کہ آنکھیں پھوٹ گئیں ہیں؟ دیکھتے نہیں ہو، یہ مجھے کیا کر دیا؟ غرض یہ کہ بوڑھے میاں پر خوب برسنے لگا۔ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھول پوری رَحِمَہُ اللہُ اس واقعے کو بیان کر کے فرماتے ہیں کہ دیکھو وہ نمازی وذاکر وشاغل تو ہو گیا؛ مگر انسانیت اس کے اندر نہیں آئی۔

دیکھیے! ذکر کر رہا ہے، فکر کر رہا ہے، اللہ کے سامنے عاجزی کر رہا ہے، دیکھنے میں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بزرگ ہو گیا ہے؛ لیکن اس کے باوجود اندر سے انسانیت نہیں بنی، ایک آدمی کے پیر لگ جانے پر وہ بھڑک اٹھا اور گالیاں دینے لگا۔ ایسے آپ کو بہت سارے واقعات ملیں گے، لوگ ایک طرف نماز بھی ادا کرتے ہیں، تہجد پر تہجد بھی پڑھتے ہیں، ذکر پر ذکر بھی کرتے رہتے ہیں؛ لیکن اگر ان کے مزاج کے خلاف ذرہ برابر بھی کوئی بات پیش آجائے، تو وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے، اب اس کے بعد ان کو دیکھیے، تو وہ ایک شیطان نظر آتے ہیں یا کوئی خون خوار جانور نظر آتے ہیں کہ جنگل سے کوئی شیر یا باگ آ گیا ہے اور یہ اس دوسرے آدمی کو کھا جائے گا، اسی وجہ سے یہ آدمی بزرگ چاہے ہو؛ لیکن ہم کہیں گے کہ وہ انسان نہیں ہوا؛ بل کہ یہ تو بھیڑیا، شیر بنا ہوا ہے۔ تو بھائیو! اس چیز پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

تکمیلِ انسانیت بھی بعثت کے مقاصد میں ہے

جنابِ محمد رسول اللہ ﷺ کے دنیا میں آنے کے دو مقاصد ہیں: ایک مقصد تکمیلِ ایمان ہے اور دوسرا مقصد تکمیلِ انسانیت ہے۔ دونوں مقاصد کو لے کر اللہ کے نبی ﷺ دنیا میں تشریف لائے تھے۔ تکمیلِ ایمان اور اسلام کا ذکر تو قرآن میں کر دیا گیا ہے:

﴿اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ أَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْنًا﴾

(آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا، تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کے طور پر (ہمیشہ لے لیے) پسند کر لیا) [المائدة:٣]

اس کے اندر تکمیلِ دین اور تکمیلِ اسلام کا ذکر آیا ہے کہ اللہ نے کہا کہ آج میں نے دینِ اسلام کو مکمل کر دیا۔

اسی طرح حدیث میں بھی تکمیلِ ایمان کا ذکر موجود ہے؛ چناں چہ حدیث میں آتا ہے کہ آقائے نام دار حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”میری اور انبیائے سابقین کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے ایک محل بنایا، بڑا حسین وجمیل اور خوبصورت ؛مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی ، اب لوگ اس عمارت کو گھوم گھوم کر دیکھنے لگے اور تعجب کرنے لگے اور کہنے لگے کہ یہ اینٹ کیوں نہیں رکھی گئی؟ پس میں وہ اینٹ ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔

(بخاری:۳۵۳۵)

یہ تکمیلِ ایمان اور تکمیلِ دین ہے،اللہ کے نبی ﷺ ایک تو اسی لیے آئے تھے کہ دینِ اسلام کو مکمل کردیں۔ یہ ایک مقصد ہے آپ کے اس دنیا میں آنے کا۔

دوسرا مقصد ہے تکمیلِ انسانیت،اس کا ذکر آپ ﷺ نے خود اپنی زبانِ مبارک سے فرمایا؛ چناں چہ اللہ کے نبی ﷺ فرماتے ہیں:

”بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ“ (مجھے اس لیے بھیجا گیا ہے کہ میں مکارمِ اخلاق کی تکمیل کروں) (سنن الکبریٰ للبیهقي: ۲۱۳۰۱)

ایک حدیث میں فرمایا: ”إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّماً“ (مجھے اللہ نے معلمِ انسانیت بنا کر بھیجا ہے) (سنن ابن ماجه: ۲۲۹)

اسی کا نام دراصل انسانیت کی تکمیل ہے،انسان کے اخلاق اگر مکمل ہوجائیں، تو انسانیت مکمل ہوجاتی ہے؛ چناں چہ اللہ کے نبی ﷺ نے دونوں کام کیے اور اس کے نتیجے میں ایسے بہترین انسان وجود میں آئے کہ اس سے بہتر انسان دنیا میں کبھی نہیں پیدا ہوے۔صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ انسانِ کامل بنے،عمر فاروق رضی اللہ عنہ

انسانِ کامل بنے اور صحابہ رضی اللہ عنہم انسانِ کامل بنے۔

کامل انسان کیسے ہوتے ہیں؟ ایک قصہ

حدیث میں قصہ آیا ہے کہ ایک دفعہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان دونوں کے درمیان میں آپس میں کچھ بات چیت ہوگئی، جس کی وجہ سے سیدنا عمر فاروق، حضرت ابوبکر صدیق سے ناراض ہوگئے اور ناراض ہوکر اپنے گھر کی طرف جانے لگے، صدیقِ اکبر ان کو منانے کے لیے ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگے؛ لیکن حضرت عمر آگے چلے گئے اور گھر میں داخل ہوگئے اور اندر جاکر دروازہ بند کرلیا؛ حضرت صدیق اکبر واپس تشریف لے آئے اور ان کو بڑا افسوس ہوا کہ میری فلاں بات سے عمر فاروق کو تکلیف پہنچی اور وہ اس سے ناراض ہوگئے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ابھی کہنے نہیں پائے تھے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق اکبر اور دوسرے موجود صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ ایسا لگتا ہے کہ صدیقِ اکبر کسی سے جھگڑ کر آرہے ہیں۔ یہ اندازے سے فرمایا تھا، جو آپ کی بصیرت تھی، آپ کی فراست تھی یا یہ کہ اللہ نے آپ کو بہ ذریعہ وحی بتلا دیا تھا۔ الغرض! صدیقِ اکبر کہنے لگے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھ سے خطا ہوگئی اور میں نے ایک جملہ کہہ دیا جس کی وجہ سے عمر کو ناراضگی ہوگئی اور وہ گھر چلے گئے؛ لیکن میں ان کو منانے گیا، تو انہوں نے اندر جاکر دروازہ بند کرلیا، اب میں آپ کی خدمت میں آیا ہوں۔

یہاں یہی بات چیت ہو رہی تھی اور اُدھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں بھی خیال ہونے لگا اور احساس ہوا کہ صدیقِ اکبر مجھے منانے کے لیے آرہے تھے، میں نے یہ

کیا حماقت کی کہ میں نے دروازہ بند کرلیا۔؟! یہ کونسی انسانیت ہے؟! مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، میں نے کیسی غلطی کی! مجھے دروازہ بند نہیں کرنا چاہیے تھا؛ بل کہ صدیقِ اکبر آرہے تھے، تو مجھے آنے دینا چاہیے تھا۔ یہ سوچ کر حضرت عمر نے دروازہ کھولا، باہر جاکر دیکھا، وہ نہیں تھے، تو ان کی تلاش میں نکلے، یہاں تک کہ تلاش کرتے کرتے اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں پہنچے، وہاں پر دیکھا کہ صدیق اکبر پہلے سے موجود ہیں، انہوں نے سوچا کہ بہت اچھا موقع ہے، اللہ کے نبی کی خدمت میں یہ مسئلہ حل کرلیں گے؛ لیکن جاکر مسئلہ کیا عرض کرتے ؟ پہنچے اور رونے لگے اور کہا کہ یارسول اللہ! مجھ سے غلطی ہوگئی۔

اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ساری باتیں سنی اور کہا کہ ایک دوسرے کو در گذر کرو اور پھر حضرت عمر کی طرف دیکھتے ہوئے ایک عجیب جملہ ارشاد فرمایا کہ: ’’عمر! یادرکھو یہ صدیق وہ شخص ہے کہ جب میں نے ’’یا أیها الناس قو لوا لا إله إلا اللّٰه‘‘ کہا تھا تو، لوگوں نے مجھے کہا تھا’’ کَذَبْتَ ‘‘(تم جھوٹے ہو)اور صدیق نے کہا’’ صَدَقْتَ‘‘(آپ نے سچ کہا)۔ یہ ہے مقام حضرت صدیق کا؛ اس لیے ان کو راضی کرو۔ یہ کہہ کر حضور اقدس صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے مسئلہ حل فرمادیا۔

دیکھو بھائیو! انسانیت کیسی ہوتی ہے؟! اس کی مثال دے رہا ہوں، صدیقِ اکبر کی انسانیت دیکھو، غلط جملہ انسان سے نکل سکتا ہے؛ لیکن زبان سے نکلنے کے بعد انسان اگر انسان ہے، تو اس پر وہ اَڑتا نہیں ہے؛ بل کہ اللہ کے سامنے گڑگڑاتا ہے، صدیقِ اکبر کہہ رہے ہیں کہ مجھ سے خطا ہوگئی اور عمر پریشان ہو رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں، مجھ سے غلطی ہوگئی۔

یہ ہیں انسان، اِدھر یہ کہتے ہیں کہ مجھ سے غلطی ہوگئی اور وہ اُدھر کہتے ہیں کہ مجھ

سے غلطی ہوگئی، آج کے انسانوں کا حال یہ ہے کہ یہ کہتا ہے کہ تیرے سے غلطی ہوئی میرے سے نہیں اور وہ کہتا ہے کہ میرے سے نہیں تیرے سے ہوئی؛ یہ ہے انسانیت کا فرق۔ آج لوگ جھگڑے پیدا کرتے ہیں، اختلافات پیدا کرتے ہیں، مارنے مرنے تیار ہو جاتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہروں میں جنگلی جانوروں کا بسیرا ہوگیا ہے، یہ صورتِ حال ہم نے پیدا کرلی ہے۔ انسان مفقود ہیں، انسانیت بھی مفقود ہے۔

بھائیو! آج اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم توجہ کریں کہ ہم صرف یہ نہیں کہ نماز روزے کے پابند ہوں گے؛ بل کہ اس کے ساتھ ہم اس بات کی بھی کوشش کریں کہ ہم بہترین انسان ہو جائیں؛ اس لیے میں نے کہا کہ اللہ کے نبی تشریف لائے تھے، تو ایک مقصد آپ کا تکمیلِ دین تھا اور ایک مقصد آپ کا تکمیلِ انسانیت تھا؛ اس لیے انسانیت کو بھی مکمل کرنے کی کوشش ہونی چاہیے۔

انسان بننے کے لیے تین چیزیں ضروری

ہمیں اپنے آپ کو انسان بنانے کے لیے، ایسی باتوں پر عمل کرنا چاہیے، جن کو اپنانے سے انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔

میں نے اس سلسلے میں تجزیہ کیا کہ انسان کو انسان بننے کے لیے کیا چیزیں ضروری ہیں؟ تو مجھے ایک بات سمجھ میں آئی، وہی بات آپ کے سامنے رکھنے کی کوشش کروں گا۔ اور وہ بات یہ ہے: ایک انسان کو انسان بننا ہے، تو اسے تین چیزوں کی بڑی سخت ترین ضرورت ہے۔

(۱) آداب کی تحصیل

(۲) اخلاق کی تکمیل

(۳) حقوق کی رعایت

ہماری شریعت نے بے شمار آداب کی تعلیم دی ہے، جب تک آداب کوملحوظ نہیں رکھا جائے گا، اس وقت تک کوئی انسان نہیں بن سکتا۔ آداب میں بہت ساری چیزیں ہیں جیسے: کھانے کے آداب، پینے کے آداب، پہننے کے آداب، بول چال کے آداب، کسی سے میل ملاقات کے آداب، بہت ساری چیزیں انسان کو دنیا میں پیش آتی ہیں اور ان ساری چیزوں میں انسان کو کچھ آداب کی ضرورت پیش آتی ہے اور اگر وہ ان آداب کی رعایت نہیں کرتا، تو پھر وہ جانوروں کی طرح ہے، وہ انسان نہیں ہوسکتا۔

اور دوسری چیز جو انسان کو انسان بننے کے لیے ضروری ہے، وہ ہے اخلاق اخلاق سے انسان انسان بنتا ہے۔ جیسے انسان کے دل میں رحم ہو، کرم ہو، ہمدردی ہو، غم خواری ہو، لوگوں کے لیے بھلائی کا جذبہ ہو اور کینہ نہ ہو، حسد نہ ہو، بغض نہ ہو، اس طرح کی جو چیزیں ہیں، ان کو اخلاق سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ایک انسان واقعی انسان اسی وقت بن سکتا ہے؛ جب کہ وہ ان اخلاق کا حامل ہو، اچھے اخلاق اس کے اندر ہوں، بُرے اخلاق اس کے اندر نہ ہوں، یہ دوسری چیز ہے۔

اخلاق اور آداب میں فرق یہ ہے کہ آداب کا تعلق ظاہر سے ہوتا ہے اور اخلاق کا تعلق باطن سے ہوتا ہے۔

اور ایک تیسری چیز جس سے انسان، انسان بنتا ہے، اس کو ہم تعبیر کر سکتے ہیں حقوق کے نام سے۔ ایک انسان کا جب دوسرے انسانوں سے اور دیگر مخلوقات سے رابطہ و تعلق ہوتا ہے، تو اس وقت اس پر ان مخلوقات کے کچھ حقوق عائد ہو جاتے ہیں، جب ان حقوق کی پاس داری انسان کرتا ہے، تب اسے انسان کہا جاتا ہے اور اگر ان حقوق کی پاس داری وہ نہیں کرتا، تو اس کو انسان نہیں کہا جا سکتا۔ ماں باپ کے کیا

حقوق؟ بیوی بچوں کے کیا حقوق؟ پڑوسیوں کے ساتھ اس کو کیسا رہنا چاہیے؟ ان کے کیا حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں اور دوسرے لوگوں اور دوسری مخلوقات کے کیا حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں؟ ان سارے حقوق کی رعایت کیے بغیر کوئی انسان نہیں بن سکتا۔

مثلاً ایک آدمی ماں باپ کے حقوق ادا نہیں کرتا، کیا آپ اس کو انسان کہیں گے؟ جب ماں باپ اس کے ہیں، تو اگر وہ انسان ہے، تو ماں باپ کا حق ادا کرنا اس پر ضروری ہے اور انسان ہونے کے ناطے اس پر یہ ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ صرف شرعی اصول نہیں ہے؛ بل کہ انسانیت کے حقوق ہیں، انسانیت اس کا تقاضہ کرتی ہے؛ اس لیے آپ دیکھ لیجیے کہ غیر مسلم بھی ماں باپ کی بے حد تعظیم کو ضروری سمجھتے ہیں اور ماں باپ کی تحقیر کو کبھی گوارہ نہیں کر سکتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ انسانی حقوق ہیں، مسلمان ہے تب بھی اس کے لیے ضروری، کافر ہے تب بھی اس کے لیے ضروری۔

اب خلاصہ یہ ہوا کہ انسان کو انسان بننے کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں: ایک حقوق کی رعایت، دوسرے اخلاق کی تکمیل اور تیسرے آداب کی تحصیل۔ جب یہ تین چیزیں ہم لے کر چلیں گے، تو ان شاء اللہ ہم بہترین انسان بن جائیں گے، مسلمان تو بن ہی جائیں گے ان شاء اللہ؛ لیکن اسی کے ساتھ بہترین انسان بن جائیں گے اور اگر یہ چیزیں ہمارے اندر نہ ہوں، جیسا کہ آج ہمارے اندر مفقود ہیں کہ ایک انسان نماز بھی پڑھتا ہے، اس کے باوجود وہ انسان نہیں ہے، بہت سے لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ ذکر بھی کرتے ہیں، فکر بھی کرتے ہیں، ریاضت و مجاہدہ بھی کرتے ہیں؛ لیکن اس کے باوجود ان کے اندر نہ اخلاق ہیں، نہ آداب کی رعایت ہے، نہ ان کے اندر حقوق کا کوئی لحاظ ہے۔

آداب کی تحصیل

انسانیت کے لیے سب سے پہلی چیز جو میں نے عرض کی، وہ آداب کی تحصیل ہے؛ کیوں کہ انسان کو انسان بننے کے لیے آداب کی بڑی سخت ترین ضرورت ہے؛ لہٰذا کوشش یہ ہو کہ ہم سب کے سب مؤدب بنیں یعنی آداب کے حامل بن جائیں، ہر چیز آداب کے ساتھ ہونی چاہیے۔

نبی اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ہر چیز کے آداب سکھائے، یہ تکمیلِ انسانیت کا ایک پہلو ہے، کھانے کے آداب سکھائے، پینے کے آداب سکھائے، چلنے اور پھرنے کے آداب سکھائے؛ ہنسنے اور رونے کے آداب سکھائے، سفر میں جانے اور آنے کے آداب سکھائے۔ الغرض! زندگی کے ہر کام کے آداب سکھائے اور آداب کا ذکر صرف حدیث میں نہیں؛ بل کہ قرآن میں بھی بے شمار آداب کی تعلیم دی گئی ہے۔

قرآن نے چلنے کا ادب سکھایا

قرآن کریم ایک جگہ کہتا ہے:

﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا﴾

(زمین پر اکڑ کر نہ چلو) [بني إسرائيل :۳۷]

چلنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے، اللہ نے وہ طریقہ سکھایا کہ اکڑ اکڑ کر چلنا یہ انسانوں کا طریقہ نہیں ہوا کرتا؛ بل کہ تواضع کے ساتھ چلنا چاہیے۔

ایک جگہ قرآن میں ہے:

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا﴾

(اور رحمان کے بندے وہ ہیں، جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں)

[الفرقان: ٦٣]

اسی طرح قرآن ایک اور جگہ کہتا ہے:

﴿وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ﴾ (چلنے میں میانہ روی اختیار کرو)

[لقمٰن: ۱۹]

بہت جلدی جلدی مت چلو کہ لوگ پریشان ہو جائیں کہ بھائی اس کو کیا مصیبت پیش آ گئی ہے؟ جو اس قدر جلدی چل رہا ہے اور اتنا آہستہ بھی نہ چلو کہ لوگ آ کر خیریت پوچھنے لگیں کہ جناب کی ٹانگوں میں درد تو نہیں؟

معلوم ہوا کہ انسان چلنے میں آداب کی رعایت کرتا ہے، ورنہ وہ انسانوں میں شامل نہیں ہوتا۔

بول چال میں بھی ادب چاہیے

قرآن نے بول چال کا ادب بھی سکھایا ہے، ارشاد ہے:

﴿وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ﴾

(اور اپنی آواز پست رکھو! بے شک سب سے بُری آواز گدھے کی آواز ہے)

[لقمٰن: ۱۹]

بہت زیادہ آواز سے نہ بولو؛ بل کہ ذرا آواز کو پست کر کے کلام کرو، چیخ چیخ کر نہ بولو، چیخ چیخ کر بولنا انسانوں کا کام نہیں ہے؛ بل کہ گدھوں کا کام ہے۔

جیسے بعض لوگ زبان استعمال کرتے ہیں؛ لیکن ایسی بھونڈی زبان استعمال کرتے ہیں کہ سننے والا نفرت کرنے لگتا ہے؛ اگر انسان انسان بن جائے گا، تو اسے بولنے کا طریقہ آ جائے گا کہ مجھے کیسا بولنا چاہیے؟ الفاظ کیسے استعمال کرنا چاہیے؟ بہترین سے بہترین الفاظ ہوں، لب ولہجہ پیارا ہو، لوگوں کے دل میں اترنے والا ہو؛ کیوں کہ بات بات میں فرق ہوتا ہے، اگر اچھی بات آپ کریں گے، تو اس کا

اچھا اثر مرتب ہوگا اور اسی بات کو پلٹ کر بُرے لب و لہجے میں آپ کہہ دیں گے، بات تو وہی ہوگی؛ لیکن لب و لہجے کے بدل جانے اور انداز کے فرق کی وجہ سے اس کا اثر دوسرا مرتب ہوگا۔

مثال کے طور پر ایک آدمی سے آپ نے کہا (ذرا تُرش انداز میں) کیا ہے؟ تو وہ آپ کو تھپڑ مارنے تیار ہو جائے گا؛ لیکن آپ اس سے کہیں (پیار بھرے انداز میں) کیا ہے؟ وہ آپ کے قریب ہو جائے گا، دیکھو جملہ ایک ہی ہے، جس میں دو ہی لفظ ہیں؛ لیکن ایک کو اِس طرح بولو، تو ایک اثر اور اُس طرح بولو، تو دوسرا اثر۔ وہی جملہ اِس طرح استعمال کرو، تو دلوں میں پیار پیدا ہو اور اُس طرح استعمال کرو، تو دلوں میں خار پیدا ہو۔

الفاظ کے اچھے بُرے اثرات - ایک واقعہ

ایک واقعہ سنا تھا کہ ایک بادشاہ نے ایک خواب دیکھا کہ اس کے سارے دانت جھڑ گئے ہیں، تو اس کو بہت عجیب لگا، پھر اس نے معبرین کو بلایا اور خواب کی تعبیر پوچھی، تو ایک معبر نے یہ تعبیر دی کہ "آپ کے سامنے آپ کے خاندان کے سب لوگ مر جائیں گے"، بادشاہ نے یہ تعبیر سن کر حکم جاری کیا کہ اس معبر کو قید میں ڈال دیا جائے۔ پھر ایک اور معبر کو بلایا اور اس سے بھی تعبیر پوچھی، اس نے بھی وہی تعبیر دی اور اس کو بھی جیل خانے میں ڈال دیا گیا، اسی طرح کئی معبرین کے ساتھ ہوا، پھر اخیر میں ایک معبر کو بلایا گیا اور اس سے تعبیر معلوم کی، تو اس نے کہا کہ "آپ کی عمر آپ کے خاندان میں سب سے زیادہ ہوگی"، بادشاہ یہ تعبیر سن کر خوش ہو گیا اور اس معبر کو انعام و اعزاز سے نوازا۔

اب بتاؤ! دونوں تعبیروں میں کیا فرق ہے؟ اگر یوں کہا کہ "آپ کے سامنے

آپ کے خاندان کے سب لوگ مر جائیں گے"، تو اس میں اور اگر یوں کہا کہ "آپ کی عمر آپ کے خاندان میں سب سے زیادہ ہوگی"، تو اس میں معنے کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں، ایک ہی بات ہے؛ لیکن پہلی تعبیر دینے والوں کو قید میں جانا پڑا اور دوسری تعبیر بیان کی، تو اس پر انعام دیا گیا۔ کیوں؟ بات کرنے کا لب ولہجہ، بات کرنے کا ایک انداز اور ایک طریقہ ہوتا ہے، باادب انسان کا طریقہ اور ہوتا ہے، بے ادب انسانوں کا طریقہ اور۔ پھر اس میں یہ بھی داخل ہے کہ بڑے کا لحاظ اور چھوٹے کا لحاظ اور اپنے کا لحاظ، جس سے بھی ہم گفتگو کریں گے، وہ تین طرح کے لوگ ہوں گے یا تو وہ عمر میں بڑے ہوں گے یا علم میں بڑے، مقام ومنزلت میں بڑے، عہدے میں بڑے یا نہیں، تو ہم عمر ہوں گے یا نہیں تو ہمارے سے چھوٹے ہوں گے، ہر ایک کے لیے الگ الگ انداز کی گفتگو ہوتی ہے، ایک ہی انداز وطریقے کی گفتگو ہر ایک کے لیے نہیں ہو سکتی۔ ہر ایک کے لیے لب ولہجہ بھی الگ ہوتا ہے اور اندازِ گفتگو بھی الگ ہوتا ہے۔ اگر اس کی رعایت کیے بغیر کوئی انسان بات کرتا ہے، تو وہ بے ادب انسان ہے اور اس کی رعایت کے ساتھ گفتگو کرتا ہے، تو وہ باادب انسان ہے، یہ ہے باادب اور بے ادب انسان کا فرق۔

ایک آدمی اپنے ابا جی سے کہنے لگے "آپ کی بیوی بلا رہی ہے" بات صحیح ہے۔ مگر تھپڑ لگیں گے۔ بات تو صحیح ہے؛ لیکن اس کے باوجود یہ بات ابا سے نہیں کی جا سکتی، چاہے تو ایسی گفتگو ساتھی سے کرلے، کبھی ساتھیوں میں مزاحاً مذاقاً اس طرح کی گفتگو ہو سکتی ہے، آداب میں یہ سب کچھ داخل ہے؛ لیکن بیش تر لوگ ایسے ہیں، جو ان کی کوئی رعایت نہیں کرتے۔

بعض لوگ علما کے پاس جاتے ہیں؛ علما کے پاس جانے کے لیے بھی آداب

ہیں؛ اس لیے کہ علما اونچے مقام پر ہیں، چاہے وہ عمر میں آپ کے برابر ہوں؛ لیکن مقام میں بڑے ہیں، اگر ہم کسی عالم کی خدمت میں جائیں، تو ادب کے ساتھ بیٹھنا چاہیے، انداز بہترین ہونا چاہیے اور سوچ کر، سمجھ کر، مناسبِ حال گفتگو کرنا چاہیے اور زیادہ تر تو سننے کے لیے جانا چاہیے، سنانے کے لیے نہیں جانا چاہیے، اگر عالم کے پاس آدمی سنانے کے لیے جا رہا ہے، تو وہ بے ادب ہے، سننے کے لیے جا رہا ہے، تو وہ با ادب انسان ہے، کیوں؟ اس لیے کہ عالم سے استفادہ کرنا مقصود ہوتا ہے، اسے افادہ کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ یہ بھی آداب میں داخل ہے؛ لیکن کتنے لوگوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ اس سلسلہ میں ناکارے ہیں، انہیں خبر ہی نہیں کہ کیسی گفتگو ہونا چاہیے؟ کیا گفتگو ہونا چاہیے؟ کتنی گفتگو ہونا چاہیے اور گفتگو کرنا بھی چاہیے کہ نہیں کرنا چاہیے۔

بولنے کا سلیقہ قرآن سے سیکھیں

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ ﴾ (یاد کرو اس وقت کو! جب کہ ابراہیم کعبے کی بنیادیں رکھ رہے تھے اور اسماعیل بھی)

[البقرۃ:۱۲۷]

یہاں غور کریں، کیا کہنا چاہتے ہیں؟ بولنا یہ چاہتے ہیں کہ یاد کرو اس وقت کو جب کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام یہ دونوں کعبے کی بنیادیں رکھ رہے تھے۔ یہ بتانا و سمجھانا ہے؛ لیکن بولنے کا جو انداز ہے، اس میں ایک بہت بڑا ادب سکھایا گیا ہے؛ ادب یہ سکھایا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام باپ ہیں، بڑے ہیں؛ اس لیے ان کا ذکر پہلے کر دیا اور یہ کہا ”ابراہیم نے بنیادیں

رکھیں'' اور اسماعیل علیہ السلام چوں کہ چھوٹے ہیں، صاحبزادے ہیں؛ اس لیے کہا ''اور اسماعیل نے بھی ساتھ دیا'' یہ دونوں کو ملا کر بھی کہا جا سکتا تھا۔ مگر انداز بدل دیا، کیوں؟ اس لیے کہ یہی ادب کا تقاضا ہے، بیٹے کا درجہ کم ہے، اس لیے ان کو برابر درجہ میں نہیں کھڑا کیا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم سے بولنے کا ادب سیکھیے

ایک مرتبہ حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں، حضور سے عمر میں دو سال کے بڑے تھے، ایک بار کسی نے ان سے پوچھ لیا کہ '' أنتَ أكبرُ أمْ رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم ؟ (آپ بڑے ہیں یا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بڑے ہیں؟) پوچھنے والے کا مقصد عمر کے بارے میں معلوم کرنا تھا، تو انہوں نے جواب میں کہا: '' هُوَ أكبرُ مني وَأنَا وُلِدْتُ قَبْلَهُ '' (بڑے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، ہاں میری پیدائش آپ سے پہلے ہوئی ہے) (مصنف ابن أبي شيبه: ۱۲۶۷۸، الآحاد والمثاني: ۳۵۰)

اسی طرح حضرت قباث بن اشیم رضی اللہ عنہ جو بنو عمرو بن لیث میں سے تھے، ان سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ یا عبد الملک بن مروان نے پوچھا کہ آپ بڑے ہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ؟ تو انھوں نے جواب میں کہا: '' هُوَ أكبرُ وَأنَا أسَنُّ مِنهُ'' (بڑے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، میری تو صرف عمر بڑی ہے)

(المعجم الكبير للطبراني: ۱۵۴۲۱، مستدرک حاکم: ۶۶۲۴، الآحاد والمثاني: ۵۶۶، مشكل الآثار: ۵۹۷۰)

اور ترمذی اور طحاوی کی روایت میں ان کا جواب ان الفاظ سے نقل کیا ہے:
'' هُوَ أكبرُ وأنَا أقدم منه في الميلاد '' (بڑے تو آپ ہی ہیں، میں

پیدائش میں آپ سے پہلے ہوا ہوں) (ترمذي: ٣٦١٩، مشكل الآثار: ٥٩٦٩)

ان حضرات کے جوابِ لاجواب پر غور کیجیے، ان کے اندر کے ادب کو دیکھیے، بولنے کے طریقے کو دیکھیے۔ بولنے میں بھی لیاقت چاہیے کہ بڑا کون ہے، چھوٹا کون ہے؟

دعوت میں جانے کے آداب

اسی طرح ایک ادب جس کی قرآن نے تعلیم دی یہ ہے کہ کہیں دعوت میں جاؤ تو، کیسا معاملہ ہونا چاہیے؟ اللہ نے اس کے بارے میں بھی قرآن میں سکھایا:

﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ إِلَّآ أَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ إِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ إِنٰهُ وَلٰكِنْ إِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَأْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ ، إِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ وَ اللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ﴾ [الأحزاب:٥٣]

(اے ایمان والو! نبی کے گھر میں (بلا اجازت) داخل مت ہو، مگر یہ کہ تمہیں کھانے پر آنے کی اجازت دی جائے، وہ بھی اس طرح کہ تم اس کھانے کی تیاری کے انتظار میں بیٹھے نہ رہو؛ لیکن جب تمہیں بلایا جائے تب جاؤ، پھر جب کھانا کھا چکو، تو اپنی اپنی راہ لو اور باتوں میں جی لگا کر مت بیٹھا کرو؛ حقیقت یہ ہے کہ اس بات سے نبی کو تکلیف پہنچتی ہے اور وہ تم سے (کہتے ہوئے) شرماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ حق بات میں کسی سے نہیں شرماتا)

یہ آیت ایک خاص واقعے میں نازل ہوئی ہے، وہ یہ کہ جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا، تو ولیمے کی دعوت کی

اور جو حضرات دعوت میں آئے تھے، انھوں نے کھانا کھا لینے کے بعد بھی وہیں بیٹھ کر باتیں کرنا شروع کردیا، جس سے اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو بہت تکلیف گزری؛ مگر آپ نے اس موقعے پر ان کو اس سے منع کرنے میں شرم محسوس کی، اس موقعے پر یہ آیت نازل ہوئی، جس میں دعوت میں جانے کے تین آداب بیان فرمائے ہیں:

(۱) پہلا ادب یہ بتایا گیا ہے کہ بغیر اجازت کسی کے گھر میں داخل ہونا منع ہے؛ لہٰذا بغیر دعوت کے کسی کی یہاں نہیں جانا چاہیے۔

(۲) دوسرا ادب یہ سکھایا کہ اگر تم کو کہیں کسی دعوت میں بلایا جائے، تو وقت سے پہلے جا کر کھانے کے انتظار میں مت بیٹھو۔

(۳) تیسرا ادب یہ بتایا کہ جب کھانے سے فارغ ہوجاؤ، تو کھانے کے بعد وہاں بیٹھ کر باتوں میں مشغول مت ہوجاؤ؛ بل کہ دعوت میں جاؤ، کھاؤ اور فوراً وہاں سے نکل جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم وہاں بیٹھ کر گفتگو میں مشغول ہوجاؤ اور گھر والوں کو تکلیف گذرنے لگے۔

یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں؛ لیکن نتائج کے لحاظ سے بڑی ہیں؛ لہٰذا آداب میں یہ سب چیزیں داخل ہیں اور جب ان سارے آداب کو اپنے اندر پیدا کرلیں گے، تو اس سے دوسروں کو راحت ملے گی، تکلیف نہیں ہوگی اور خود اپنا بھی وقار رہے گا، عزت رہے گی، بے عزتی نہیں ہوگی۔

قرآنِ کریم جیسے عظیم کلام و کتاب میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہمیں یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی سکھائی گئی ہیں؛ تاکہ ہم میں ادب پیدا ہوجائے اور یاد رکھیں کہ یہ باتیں اگرچہ کہ چھوٹی معلوم ہوتی ہیں؛ مگر ان چھوٹی باتوں پر عمل کرنے سے آدمی بڑا

بنتا ہے۔

کھانے کے آداب کی تعلیم

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے کا طریقہ بھی بتایا اور سکھایا ہے، ہمیں کھانے کے طریقے کو بھی سیکھنے کی بڑی اشد ضرورت ہے، آج کل بہت سارے لوگوں نے جانوروں کی دیکھا دیکھی اور انگریزی اقوام کی دیکھا دیکھی جانوروں اور انگریزوں کا سسٹم (SYSTEM) اختیار کرلیا ہے؛ چناں چہ اب لوگوں نے بفیٹ سسٹم (BUFFET SYSTEM) شروع کردیا ہے، بفے سسٹم یہ ہوتا ہے کہ ایک جگہ کھانے پینے کی تمام چیزیں بنا کر رکھ دی جاتی ہیں اور لوگ وہاں جا کر خود کھانا اس طرح مانگ کرلاتے ہیں جیسے کوئی بھیک مانگنے والا لاتا ہے اور جہاں چاہتے ہیں چلتے پھرتے اور کھڑے کھڑے کھالیتے ہیں، اگر درمیان میں کھانے کی ضرورت ہوتی ہے، تو پھر وہیں جاتا اور مانگ کرلاتا ہے۔

غور کریں کہ یہ طریقہ کس قدر بُرا اور غیر مہذب ہے، جانوروں کی طرح چلتے پھرتے اور کھڑے کھڑے کھانے کا؟ اس کے برخلاف اسلام نے کھانے کا سنت طریقہ یہ سکھایا ہے کہ دسترخوان پر بیٹھ کر کھایا جائے، باادب طریقے سے کھایا جائے، بیٹھ کر کھانے میں عاجزی بھی ظاہر ہوتی ہے اور تہذیب و ادب بھی، کھڑے ہو کر کھانے میں تکبر و بدتہذیبی ظاہر ہوتی ہے، اسی طرح بیٹھ کر کھانے میں، انسانیت جھلکتی ہے اور کھڑے ہو کر کھانے میں، حیوانیت نمایاں ہوتی ہے۔

کھانے کا ایک ادب یہ ہے کہ دسترخوان بچھایا جائے اور ادب کے ساتھ اس کے سامنے بیٹھے پھر کھایا جائے۔ دسترخوان کا فائدہ یہ ہوگا کہ کوئی لقمہ یا دانہ نیچے گر جائے، تو اسے اٹھا کر صاف کر کے کھایا جاسکے، کوئی گرد اُس پر نہ لگے اور فرش بھی

اس کی وجہ سے گندہ نہ ہو۔

اور کھانا برتن میں سے اپنے سامنے سے نکال کر کھایا جائے کہ یہ بھی ادب ہے، نبی کا طریقہ ہے۔حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے یہ بھی فرمایا:

"کُلْ مِمَّا یَلِیْکَ" (اپنے سامنے سے کھاؤ)

[البخاری:۵۳۷۷]

ایک آدمی کے سامنے کھانا رکھا ہوا ہے اور وہ اپنے سامنے سے کھانے کے بجائے دوسری طرف سے ہاتھ ڈالتا ہے،کبھی اِدھر سے،کبھی اُدھر سے ہاتھ ڈالتا ہے، تو اب بتاؤ کہ اسے جانور کہیں گے کہ انسان کہیں گے؟

اسی طرح ہم کوسکھایا گیا کہ پہلے ہاتھ دھو کر آؤ،ہاتھ کیوں دھوتے ہیں؟اس لیے کہ ہوسکتا ہے ہاتھ میں کوئی ایسی چیز لگی ہوئی ہو، جومناسب نہ ہو یا کوئی گندگی لگی ہوئی ہو یا دھول اس میں موجود ہواور سائنس داں بھی کہتے ہیں کہ اگر دھول ہاتھوں میں لگی ہوئی ہواور وہ پیٹ میں چلی جائے،تواس کی وجہ سے نقصانات ہوسکتے ہیں۔

کھانے کا ادب یہ بھی ہے کہ چھوٹا چھوٹا لقمہ لیا جائے اوراس کواچھی طرح چبایا جائے اور چبانے میں آواز نہ نکلے کہ اس سے دوسروں کو تکلیف ہوتی ہے اور بُرا معلوم ہوتا ہے۔

اور کھانے کا ایک اہم ادب یہ بھی ہے کہ جس مالک وخالق نے ،رزاق نے ہمیں یہ رزق پہنچایا ہے،اس کے نام سے کھانا شروع کیا جائے اور درمیان درمیان میں اس کا شکرادا کیا جائے ،اس کی حمد وثنا کی جائے کہ اس رزاق نے کتنے مراحل سے گذارنے کے بعد؟! کس قدر محنتوں کے بعد؟! کتنے افراد کی کاوشوں کے بعد یہ

رزق ہم تک پہنچایا؟! یہ سب غور نہیں کریں گے، تو ناشکری ہوگی، اور ناشکری کی وجہ سے نعمت میں کمی ہو جائے گی۔

اس طریقے پر اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے یہ سارے آداب ہم کو سکھائے ہیں، ان پر غور کیجیے کہ کتنا پیارا ہے؟! کتنا اچھا طریقہ ہے؟! کتنا اُحسن طریقہ ہے؟! یہ آداب اسلام کے علاوہ کسی کے پاس نہیں ہیں اور بھی آداب ہیں، مجھے سارے آداب گنوانا نہیں ہے؛ بل کہ توجہ دلانا ہے۔

ملاقات کے آداب

اسلام میں کسی سے ملاقات کرنے کے آداب بھی سکھائے گئے ہیں مثلاً: کسی کے پاس آپ جاؤ، تو یہ دیکھ کر جاؤ کہ اس کے ملنے کا وقت بھی ہے یا نہیں ہے۔ چند دن پہلے ایک صاحب میرے پاس ہمارے جامعہ میں آئے اور کہنے لگے: ''میں فلاں دن بھی یہاں جامعہ آیا تھا؛ مگر آپ نہیں ملے'' میں نے پوچھا کہ آپ کس وقت جامعہ آئے تھے؟ تو کہنے لگے کہ میں مغرب بعد یہاں آیا تھا؛ حال آں کہ وہ وقت میرا مدرسہ میں ملنے کا نہیں ہے، اگر میں اس وقت نہ ملوں تو کیا الزام وشکایت؟

ایک لطیفہ یاد آیا، جو خود میرے ساتھ پیش آیا تھا، وہ یہ کہ ایک مرتبہ ایک صاحب میرے گھر پر رات کے بارہ بجے آئے اور دستک دی، میں اس وقت سونے کے لیے بستر پر لیٹ چکا تھا، میرے بھائی نے معلوم کیا کہ کون؟ تو کہا کہ ایک ضروری مسئلہ معلوم کرنا ہے، میں نے بھائی سے کہا کہ تم خود مسئلہ پوچھ لو، جواب میں یہاں سے دے دوں گا، تم جواب نقل کر دینا۔ وہ صاحب یہ مسئلہ پوچھنے آئے کہ گھر میں ایک چوہا ملا ہے، اس کا کیا کروں؟ اب بتاؤ کہ ان کو کیا جواب دیا جائے؟ یہ تو ایک بہت ہی معمولی اور معروف بات ہے کہ چوہے کو کیا کرنا چاہیے، یہ معلوم کرنے رات کے

بارہ بجے آئے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ اتنے بے خبر ہوتے ہیں کہ یہ تک نہیں دیکھتے کہ ملنے کا وقت بھی ہے یا نہیں ہے۔

بہت لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ آداب کی رعایت انگریزوں کا طریقہ ہے(لاحول ولاقوۃ إلا باللّٰہ)۔ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی سے ملنے کے لیے ان سے اجازت لینا اور پہلے سے ملاقات کا وقت طے کرنا یعنی (APPOINTMENT) لینا انگریزوں کا طریقہ ہے؛ ارے!(APPOINTMENT) لفظ ان کا ہوگا؛ لیکن یہ ادب وطریقہ ہمارا ہے، انگریزوں نے اسلام ہی سے اس کو لیا ہے۔

جس زمانے میں حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے لوگوں کی اِن بے اصولیوں پر نکتہ چینی کی اور لوگوں کو اس سلسلے میں متوجہ کرنے لگے، اپنے یہاں اصول بنائے اور ملنے کے اور دیگر امور کے لیے اصول واوقات متعین فرمائے، تو لوگ کہنے لگے کہ یہ کیا ہے کہ یہ انگریز ہو گئے ہیں؟ (لاحول ولاقوۃ إلا باللّٰہ) یعنی اصول کی رعایت کا نام لوگ انگریزیت رکھتے ہیں۔ عجیب بات ہے! لوگ جب ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں، تو وقت پر جاتے ہیں، گھنٹوں انتظار کرتے ہیں، مگر علما کے پاس وقت پر جانا نہیں چاہتے، وہاں انتظار نہیں کرسکتے، اگر وہاں یہ اصول بتائے جائیں، تو اس کا نام انگریزیت رکھتے ہیں؛ حال آں کہ علما کا مقام ڈاکٹروں سے زیادہ اور بہت زیادہ ہے۔ اِن سب باتوں کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

اسی طرح ملنے کا ادب یہ بھی ہے کہ ضرورت سے زیادہ گفتگو کر کے ہم کسی کا وقت ضائع نہ کریں، لوگ آتے ہیں اور پانچ منٹ کی گفتگو کے لیے آدھا گھنٹہ کھا لیتے ہیں، بھائیو! وقت بڑی نعمت ہے، اسے ضائع کرنے کے بجائے کارآمد بنانے کی فکر ہونی چاہیے۔

فون کرنے کے آداب

حتیٰ کہ میں آپ کو بتاؤں کہ فون کرنے کے بھی آداب ہوتے ہیں؛ لیکن لوگ فون کرنے کا کوئی ادب جانتے ہی نہیں، بس جی میں آیا فوراً فون لگا دیں گے، سونے کا وقت ہو، کھانے کا وقت ہو، حتیٰ کہ بعض لوگ (مجھے بہت افسوس ہوتا ہے) عین نماز کے وقت میں فون کرتے ہیں۔ایک تو یہ ہے کہ نمازوں کے وقت میں فون بند کر دینا چاہیے؛ لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر بالفرض کوئی فون بند نہ بھی کرے، تو فون نہیں آنا چاہیے؛ اس لیے کہ جب معلوم ہے کہ یہ نماز کا وقت ہے، ایک بجے سے ڈیڑھ بجے تک، یہ ظہر کی نماز کا وقت ہے، علاقے کے سب لوگوں کو معلوم ہے (ہاں جو لوگ انڈیا کے باہر ہوں اور انہیں خبر نہ ہو کہ وہاں کا کیا وقت ہے، تو خیر! وہ مجبور ہیں) لیکن یہاں کے لوگوں کو تو معلوم ہے! جب معلوم ہے کہ نماز کے یہ اوقات ہیں، اس کے باوجود وہ ان اوقات میں فون لگاتے ہیں، تو آپ بتاؤ کہ وہ کتنے بے خبر ہیں؟ کہ انھیں خبر ہی نہیں ہے کہ نماز پڑھنے والوں کو ہم تکلیف دے رہے ہیں، ہوسکتا ہے کہ کوئی صاحب کہنے لگیں کہ نماز نہیں پڑھتے ہوں گے؟ ہمیشہ یاد رکھو کہ ہر ایک کے ساتھ اچھی نیت اور اچھا گمان رکھنا چاہیے، اس کا فائدہ یہ ہے کہ آپ کو ثواب ملے گا۔

بہر حال! یہ کہنا ہے کہ فون کرنے کے بھی آداب ہیں۔سب سے پہلے فون کے آداب پر گفتگو حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ نے ''معارف القرآن'' کے اندر کی ہے۔''استیذان'' کا جہاں مسئلہ آیا ہے، وہاں حضرت نے فون کے آداب بھی لکھ دیے ہیں۔وہاں مطالعہ کریں۔

علامہ غلام یحییٰ رحمہ اللہ صاحب کا واقعہ

الغرض! ہر باب کے متعلق آداب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، یہ انسانیت کا تقاضہ ہے، اس پر ایک واقعہ یاد آ گیا، وہ یہ کہ ہمارے بزرگوں میں ایک بزگ گزرے ہیں، جن کا نام حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمہ اللہ ہے، آپ کے مقام کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ حضرت علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ آپ کے مرید و خلیفہ تھے اور انھوں نے اپنی تفسیر کا نام آپ ہی کے نام پر " التفسير المظهري" رکھا ہے، جو عربی زبان میں ایک عمدہ تفسیر مانی جاتی ہے، حضرت مرزا صاحب رحمہ اللہ بہت بڑے اللہ والے تھے، مزاج بہت نازک ولطیف تھا اور جس کا مزاج لطیف ونازک ہوتا ہے، وہ بے ادبی کا کوئی طریقہ برداشت نہیں کرسکتا۔

حضرت کا واقعہ ہے کہ آپ کے زمانہ میں فلسفے اور منطق کے ایک بہت بڑے عالم تھے، ان کا نام تھا مولانا غلام یحییٰ۔ انہوں نے ایک کتاب بھی لکھی ہے، جس کتاب کا نام بھی ''غلام یحییٰ'' ہے، یہ فنِ منطق کی کتاب ہے۔ ایک دفعہ وہ عالم حضرت مرزا صاحب رحمہ اللہ کے پاس ملنے آئے، اجازت لینے کے بعد اندر حاضر ہوے۔ ان کی ڈاڑھی بڑی گھنی و بے ڈھنگی تھی، نہ اس میں تیل ڈالا تھا، نہ کنگھا کیا تھا، ایک طرف بڑی اور ایک طرف چھوٹی، کچھ عجیب سی تھی، اب یہ جو اندر گئے اور مرزا صاحب رحمہ اللہ کو سلام عرض کیا، تو حضرت نے سلام کا جواب دیتے ہی کہا ''بھائی! یہ جانور کہاں سے آ گیا ہے؟'' بس یہ کہنا تھا کہ وہ ڈر کر باہر نکل گئے، باہر آ کر حضرت کے خادم سے کہا کہ بھائی! حضرت نے ایسا کیوں کہا کہ جانور آ گیا ہے؟ خادم مزاج شناس تھا، اس نے کہا کہ آپ کی یہ جو ڈاڑھی ہے، اس سے حضرت کو پریشانی ہوگئی ہے، تم ذرا ڈاڑھی میں تیل لگاؤ، کنگھا کرو، اس کے بعد آپ حضرت

کے سامنے جاسکو گے؛ خیر! وہ کہیں حجام کے پاس گئے اور اپنی ڈاڑھی ذرا ڈھنگ کی بنائی اور ٹھیک ٹھاک ہو کر پھر حضرت کے پاس تشریف لائے اور پھر اجازت طلب کی، اجازت ہو گئی، اندر گئے، حضرت نے انہیں دیکھ کر فرمایا: اب بنے ہو انسان۔

دیکھیے! عالم تو تھے وہ؛ لیکن ڈھنگ نہیں تھا، تو ان بزرگ کی تعلیم کی وجہ سے ان کے اندر ادب آیا، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں یہ بھی تعلیم ہے کہ ہم اپنے آپ کو کیسا رکھیں؟ کس انداز سے بنائیں؟ یہ ہے اسلام کا طریقہ، زندگی گذارنے کا صحیح اصول و ادب۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان بزرگ نے ایسا کیوں کہہ دیا؟ ایک آدمی ملنے کے لیے آیا، تو اسے جانور بنا دیا؟ نہیں بھائیو! یہ تعلیم ہے، یہ دراصل تبلیغ ہے، دعوت ہے۔ اللہ کی اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو سکھانے کے لیے انہوں نے ایسا کہا اور اگر یہ بزرگانِ دین ہمیں نہ سکھاتے، تو پھر اور کون سکھاتا؟

دیکھنے والے کی آنکھ کو نقصان ہوگا - حدیث کا واقعہ

یہاں ایک حدیث مجھے یاد آگئی، جو بڑی عجیب ہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صاحبزادے ''حضرتِ ابراہیم'' کے انتقال پر ان کی تدفین میں تشریف لے گئے، وہ چھوٹے بچے تھے اور بچپن میں ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم قبرستان گئے اور تدفین کے بعد جب قبر اوپر سے بنائی گئی، تو قبر میں ایک جگہ سے کچھ سُراخ رہ گیا تھا، جو بند نہیں ہوا تھا، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے ارشاد فرمایا کہ اس کو سیدھی بناؤ، اس کو ٹھیک ٹھاک کرو، خیر اس کو ٹھیک کر دیا گیا۔ کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا یہ سوراخ کو بند کرنا میت کو کچھ نفع دیتا ہے؟

مطلب یہ تھا کہ قبر کو تو اوپر سے بنایا گیا ہے، اب اندر جو معاملہ ہے، وہ تو آخرت کا معاملہ ہے، اعمال پر، ایمان پر، اس کا مدار ہے، اوپر سے ٹیڑھی ہو یا کسی اور طرح کی ہو، اس سے قبر والے کو کیا پریشانی ہے؟ اس کا جواب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑا عجیب وغریب دیا۔ آپ نے فرمایا: ''أما أنها تنفعه و لا تضره ولكن يضر عين الحي '' (بے شک اس سے قبر والے میت کو نہ کوئی نفع ہے، نہ نقصان؛ لیکن زندہ لوگوں کی آنکھ کو نقصان پہنچتا ہے)۔

(المعجم الکبیر: ۲۰۲۳۱)

کیا عجیب بات کہی! اس میں تعلیم دی ہے کہ ہر چیز کو مہذب اور اچھے انداز سے ہونا چاہیے۔ یہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آداب کی تعلیم ہے، جو ہم کو عطا کی گئی؛ لیکن آج مسلمان سب سے زیادہ بے ادب بنا ہوا ہے۔

ہر چیز اسی کی مقررہ جگہ میں رکھو

آداب میں یہ بھی داخل ہے کہ کوئی بھی چیز اٹھائے، تو اسے پھر اپنی جگہ سلیقے سے رکھے، یہ نہیں کہ کہیں سے اٹھائے اور کہیں اور رکھ دے۔ یہ ادب کے خلاف ہے، اس سے خود کو بھی تکلیف ہوتی ہے اور دوسروں کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔

خود کو اس طرح تکلیف ہوتی ہے کہ اگر چیز کو بے موقعہ رکھ دیا، تو دوسرے وقت تلاش کرنا پڑتا ہے کہ کہاں رکھا، مثلاً چاقو کو اٹھا کر کسی اور جگہ رکھ دیا، اب وہ مقام یاد بھی نہیں کہ کہاں رکھا، تو ضرورت پر سارے گھر میں تلاش کرنا پڑتا ہے، اس سے تکلیف کے علاوہ وقت بھی ضائع ہوتا ہے۔ دوسروں کو اس طرح تکلیف ہوتی ہے کہ اگر وہ اس چیز کو اپنی جگہ نہیں پائیں گے، تو پریشان ہوں گے اور تلاش وجستجو میں وقت بے کار ہوگا۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ ایک چیز اس کی جگہ سے اٹھاتے تو ہیں؛ لیکن اسی جگہ رکھتے نہیں ہیں؛ اگر اسی جگہ رکھ دیں، تو اس کے اندر عافیت ہے۔

مثال کے طور پر اگر آپ اس کے عادی ہو گئے کہ اپنے گھر میں یا آفس میں یا جہاں بھی آپ رہتے ہیں، وہاں پر اپنی چیز اٹھانے کے بعد، استعمال کرنے کے بعد، اس چیز کو اسی کی جگہ پر پہنچا دیں، چاہے وہ ماچس (MATCH BOX) ہی کیوں نہ ہو، چھوٹی سی چھوٹی چیز، قینچی ہی کیوں نہ ہو۔ اب فرض کیجیے کہ رات کا وقت تھا، آپ کو ضرورت پڑ گئی قینچی کی، لائٹ موجود نہیں ہے، تو اگر ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھنے کے آپ عادی ہوں گے، تو آپ رات میں بھی اٹھ کر قینچی آرام سے اٹھا سکتے ہیں؛ لیکن آپ اگر اس بات کے عادی نہیں ہیں، تو پہلے تو آپ کو یاد ہی نہیں آئے گا کہ کہاں رکھا ہے اور سوچتے رہیں گے کہ شاید وہاں رکھا ہو یا یہاں رکھا ہو، اب دیکھا، تو نہیں ملی۔

الغرض! اگر اسی جگہ رکھنے کی عادت ہو، تو رات میں بھی پریشانی نہیں ہوگی اور اگر بے موقعہ رکھنے کی عادت ہو جائے، تو دن کے اُجالے میں بھی کافی پریشانی ہوگی۔ اس میں ایک تو پریشانی اور دوسرے وقت کا ضیاع، وقت کتنا ضائع ہوگا؟ کبھی پندرہ منٹ، کبھی آدھا آدھا گھنٹہ، تلاش کرتے رہیں گے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا ایک واقعہ

میرے شیخ حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ نے بتایا کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی ایک عادت یہ تھی کہ کوئی بھی اپنی جگہ سے چیز اٹھاتے، تو واپس اسی جگہ پہنچا دیتے تھے، ایک مرتبہ بڑھاپے کے عالم میں طبیعت بھی خراب چل رہی تھی، اسی حالت میں تہجد کے لیے اٹھے اور رات میں وضو بنانے کے لیے لوٹا اٹھایا اور وضو فرمایا، وضو کے

بعد کمزوری کی وجہ سے آپ پر بے ہوشی طاری ہوگئی، کچھ دیر بعد جب ہوش آیا، تو سب سے پہلے یہ فرمایا کہ بھائی! میرے ہاتھ میں ایک لوٹا تھا، وہ گر گیا تھا، اسے اپنی جگہ پہنچا دو؛ تا کہ دوسروں کو تکلیف نہ ہو۔

معلوم ہوا بھائیو! یہ سب باتیں آداب میں داخل ہیں اور یہ ساری چیزیں شریعت ہی کی چیزیں ہیں، کوئی غیر شرعی چیز نہیں ہے، جیسے کہ آج کل عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ان سب چیزوں کی پابندی کرنا انگریزوں کا کام ہے، مسلمانون کا نہیں "لاحول ولاقوۃ إلاباللّٰہ"۔

رکھنے اور ڈالنے کا فرق

ایک ادب یہ بھی سن لیں کہ کسی چیز کو اٹھانے اور استعمال کرنے کے بعد اس کو سلیقے کے ساتھ رکھنا چاہیے، یہ نہیں کہ کہیں بھی ڈال دیا۔

یہاں ایک بات سمجھ لیجیے کہ ایک ہوتا ہے کسی چیز کو رکھنا اور ایک ہوتا ہے کسی چیز کو ڈال دینا، ڈال دینے میں اور رکھنے میں بڑا فرق ہے، ایک چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی اٹھانے کے بعد انسان اس کے مقام پر اس کی جگہ پر سلیقے سے اس چیز کو رکھتا ہے، تو اسے کہا جاتا ہے کہ اس نے اس چیز کو رکھا اور رکھنا سلیقہ مندی سے ہوتا ہے، مہذب طریقے پر ہوتا ہے۔ اگر کوئی اس کے خلاف کسی چیز کو اٹھانے کے بعد اسے اپنی جگہ نہ رکھے، یا رکھنے کے بجائے یوں ہی ڈال کر چھوڑ دے، تو اس کو کہتے ہیں ڈالنا اور چیزوں کو کہیں ڈال کر چھوڑ دینا یہ غیر مہذب لوگوں کا طریقہ ہے، ادب اور تمیز کے خلاف ہے۔

جنتی لوگ مؤدب ہوں گے

اور قرآن کی ایک آیت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں جانے والے سب

کے سب لوگ بڑے مؤدب ہوں گے؛ شریف و مہذب ہوں گے۔ وہ آیت یہ ہے جس میں جنت کا ذکر کیا گیا:

﴿ فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَة ، وَأَكْوَابٌ مَّوْضُوعَةٌ ، وَّ نَمَارِقُ مَصْفُوفَةٌ ' وَّ زَرَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ ﴾ (اس جنت میں اونچے اونچے تخت بچھے ہوئے ہیں، پیالے رکھے ہوئے ہیں اور برابر لگے ہوئے گدے تکیے ہیں اور سب طرف قالین ہی قالین بچھے ہوئے ہیں)

دیکھیے! جنت میں اس طرح چیزوں کو سجا کر رکھا گیا ہوگا کہ تخت و پلنگ جو اونچے اونچے ہوں گے، وہ وہاں ہوں گے اور پیالیاں اور کوب جوڑ کر سلیقے و قرینے سے رکھے ہوئے ہوں گے، اور ایک طرف کو گدے و تکیے لگے ہوئے ہوں گے اور ہر جگہ قالین بچھے ہوئے ہوں گے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے اندر یہ سب چیزیں ڈالی ہوئی نہیں ہوں گی؛ بل کہ جوڑ کر سلیقے کے ساتھ رکھی ہوئی ہوں گی، یہ نہیں کہ ایک چیز وہاں ہے اور ایک یہاں اور ایک اِدھر ہے اور ایک اُدھر ہے؛ بل کہ ہر چیز قرینے و سلیقے سے رکھی ہوئی ہوگی؛ کیوں کہ اہلِ جنت میں بھی یہی قرینہ و سلیقہ ہوگا۔

جہنمیوں میں ادب نہیں ہوگا

ایک بات اور سنتے چلیے کہ جس طرح جنتی لوگوں میں ادب و سلیقہ ہوتا ہے، اسی طرح جہنمیوں میں بدتہذیبی ہوگی۔

چناں چہ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ جہنمیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿ فَإِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِئُوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴾

(جہنمی لوگ شجرۂ زقوم سے کھائیں گے، پس وہ اس سے اپنے

پیٹوں کو بھرلیں گے) [الصّٰفّٰت: ٦٦]

غور کیجیے! یہاں یہ نہیں فرمایا کہ یہ جہنمی لوگ اس کو کھائیں گے؛ بل کہ یہ فرمایا کہ اپنے پیٹ بھریں گے۔ ذرا غور فرمائیں اس نکتے پر کہ ایک انسان جب کوئی چیز کھاتا ہے، تو کھانے کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کا نوالہ بناتا ہے اور پھر منہ میں رکھتا ہے اور پھر اس کو اچھی طرح چباتا ہے، چبانے کے بعد اس کو اچھی طرح ڈھنگ سے حلق میں اتارتا ہے؛ اس کو کہتے ہیں کھانا، لغت کے اندر بھی کھانے کا یہی مفہوم ہے۔

اور ایک طریقہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کھاتا نہیں ہے؛ بل کہ پیٹ بھرتا ہے۔ مثلاً اٹھایا چبایا بھی نہیں کہ نگل گیا، بڑے بڑے نوالے اٹھا رہا ہے، منہ اتنا بڑا نہیں جتنا بڑا اس کا نوالہ ہے، وہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طریقے سے زیادہ سے زیادہ میرے پیٹ میں گھس جائے ، اس کو کہتے ہیں پیٹ بھرنا، اس کا نام کھانا نہیں ہے۔ یہ حریص آدمی کا کام ہوتا ہے، جو حرص کی وجہ سے دوسروں کا بھی ہڑپ ہڑپ کر کھالینا چاہتا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے جہنمیوں کے بارے میں اسی صورت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان میں کوئی سلیقہ نہیں ہوگا، ڈھنگ نہیں ہوگا، وہ اپنے پیٹوں میں بھر رہے ہوں گے۔

اسی طرح دنیا کے اندر بھی دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں: ایک کھاتے ہیں اور ایک پیٹ بھرتے ہیں ، یہ پیٹ بھرنے والے لوگ انسان نہیں ہوتے جانوروں کی طرح ہوتے ہیں، جہنمیوں سے ان کی مشابہت ہوتی ہے۔

وہ بھی تمہاری طرح ٹیڑھا ہوگا-ایک واقعہ

ایک قصہ یاد آ گیا کہ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رَحِمَہُ اللّٰہُ کی خدمت میں بادشاہِ وقت ملنے آیا، ملاقات ہوئی، بات چیت ہوتی رہی، درمیان میں بادشاہ کو پانی

کی ضرورت محسوس ہوئی، تو بادشاہ نے حضرت سے کہا کہ مجھے تھوڑا سا پانی چاہیے حضرت نے فرمایا کہ حضور! میرے پاس کوئی خادم نہیں ہے، میں ضعیف آدمی ہوں، اٹھ کر آپ کی خدمت نہیں کر پاؤں گا، اتنی گذارش ہے کہ وہاں پر گھڑا رکھا ہوا ہے اور اسی کے اوپر پیالی بھی رکھی ہوئی ہے، آپ براہِ کرم اس سے پی لیں؛ بادشاہ اٹھا اور پانی پی لیا اور اوپر جو پیالی تھی اس کو بادشاہ نے ذرا ٹیڑھا رکھ دیا، ڈھنگ سے نہیں رکھا، جیسے وہ پہلے ڈھنگ سے رکھا ہوا تھا، خیر! آ کر بیٹھ گیا، حضرت نے کچھ نہیں کہا۔

بادشاہ نے دیکھا کہ حضرت تنِ تنہا ہیں، کوئی خدمت گذار موجود نہیں ہے اور حضرت ہیں بہت ضعیف، تو بادشاہ کے دل میں آیا کہ حضرت نازک طبع بھی ہیں اور بڑھاپے کا عالم ہے؛ لیکن اس کے باوجود کوئی خادم نہیں؛ کیوں نہ میں اپنی طرف سے کوئی خادم مقرر کر دوں؛ چناں چہ بادشاہ نے گذارش کی کہ حضرت! اگر آپ اجازت دیں، تو میں اپنی طرف سے آپ کے لیے ایک شاہی خادم مقرر کر دوں اور اس کی تنخواہ اپنی طرف سے میں ادا کروں، حضرت نے پہلے فرمایا: مجھے اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے؛ لہٰذا آپ کوئی تکلیف نہ فرمائیں؛ لیکن بادشاہ بار بار اصرار کرنے لگے، تو حضرت نے فرمایا: حضور! رہنے دیجیے، وہ آپ کا خادم بھی آپ ہی کی طرح ٹیڑھا ہوگا، یہ دیکھیے! آپ کو تو پانی پینا بھی نہیں آیا، گلاس رکھنا بھی آپ کو نہیں آیا اور جب سے آپ نے اس کو ٹیڑھا رکھا ہے، اس کو دیکھ کر میرے سر میں درد پیدا ہو گیا ہے، اگر آپ کا کوئی خادم بھی ایسا ہی ٹیڑھا آ گیا، تو میری تو زندگی ہی مشکل ہو جائے گی۔

اس واقعے کو بتانے کا مقصد یہ ہے کہ ایک آدمی جب کوئی چیز استعمال کرتا ہے، تو اس میں سلیقہ وطریقہ ہونا چاہیے، چاہے وہ بادشاہِ وقت ہی کیوں نہ ہو یا کوئی فقیر کیوں نہ ہو۔ اصل چیز تو یہ ہے کہ آدمی کے اندر طور وطریقہ ہو، سلیقہ وقرینہ ہو۔ اب

ہم غور کر کے دیکھیں کہ ہم دن میں کتنے کام ایسے کرتے ہیں؟ اٹھاتے ہیں، رکھتے ہیں، ڈال دیتے ہیں، پھینک دیتے ہیں، غلط طریقے سے رکھ دیتے ہیں۔ یہ طریقہ آدابِ انسانی کے خلاف ہے۔

آداب کی تعلیم صرف اسلام دیتا ہے

مگر یہ دیکھ لیجیے! یہ آدابِ انسانیت سوائے اسلامی تعلیمات کے کہیں اور نہیں ملتے اور یہ مدارس وخانقاہوں کے سوا کہیں اور نہیں پڑھائے جاتے۔

اسکولوں اور کالجوں میں کھانے، پینے، لباس و پوشاک کے، اٹھنے و بیٹھنے کے، کسی سے ملنے ورخصت ہونے کے، سونے و جاگنے کے آداب کون پڑھاتا ہے؟ کہیں آپ نے سنا کہ اسکول میں یہ آداب پڑھائے گئے ہوں؟

میں ایک بات آپ کو بتاؤں کہ اسکول اور کالج والے گھر بنانا تو سکھا سکتے ہیں؛ لیکن گھر بنانے کے بعد گھر میں رہنے کا طریقہ اسلام اور مدارس والے بتاتے ہیں، گھر کا صحیح استعمال قرآن سکھاتا ہے، حدیثیں سکھاتی ہیں؛ مگر یاد رکھو کہ ایک ہے گھر بنانا اور ایک ہے گھر بسانا، جب تک ان آداب کی رعایت نہیں کی جائے گی، چاہے گھر تو بن جائے؛ لیکن گھر بسانے والی بات نہیں ہوسکتی اور گھر میں بسنے والے کبھی انسان نہیں بن پائیں گے، وہ گھر گھر نہیں؛ بل کہ جہنم ہوجائے گا۔ دنیا میں کتنے ایسے عالی شان گھر ہیں جو بنائے گئے ہیں؟!! لیکن کیا ان میں فسادات نہیں؟ جھگڑے نہیں؟ اس لیے گھر بنالینا کمال نہیں؛ بل کہ گھر میں رہنے کا سلیقہ وادب سیکھنا کمال ہے۔

اسی طرح دنیوی تعلیم وعصری تعلیم ہوائی جہاز بنانے کی تعلیم دیتی ہے، چیزوں اور آلات کے بنانے کی تعلیم دیتی ہے اور اس علم سے آلات بن جاتے ہیں؛ لیکن

انسان کے حالات نہیں بنتے؛ کیوں کہ اس کی تعلیم کالج واسکول میں نہیں دی جاتی، ان آلات کے صحیح استعمال کی تعلیم تو اسلام دیتا ہے، اسلامی مدارس دیتے ہیں۔

عصری تعلیم انسانیت کے ساتھ خاص نہیں

اسی لیے میں کہتا ہوں کہ جو علوم اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائے جاتے ہیں، یہ سارے علوم انسانوں کے ساتھ خاص نہیں ہیں، بل کہ یہ جانوروں میں بھی موجود ہیں۔ آپ کہیں گے کہ جانوروں میں کہاں؟ جی ہاں! بہت سارے یہ علوم ایسے ہیں، جو جانوروں میں بھی پائے جاتے ہیں، اپنی اپنی حیثیت سے وہ ساری چیزیں اختیار کرتے ہیں۔

جیسے جانور اپنے گھر بناتے ہیں اور بعض پرندے ایسے ہیں کہ وہ اپنے گھروں کو بنانے کے سلسلے میں باقاعدہ انجینئری کرتے ہیں، لوگ کہتے ہیں کہ ''بیّا'' نام کا پرندہ اپنا جو گھونسلہ تیار کرتا ہے، وہ گھونسلہ ایسا مضبوط اور ایسا عجیب اور ایسا بہترین ہوتا ہے کہ اس کے اندر کمرے بھی ہوتے ہیں، ڈزائننگ (DESIGNING) بھی ہوتی ہے اور پھر اس کے اندر وہ ایک جگنو کو لا کر لائٹنگ (LIGHTING) کا بھی انتظام کرتا ہے اور وہ اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ کہتے ہیں کہ اس کے اوپر پانی برسے یا ہوائیں چلیں؛ لیکن اس کے باوجود اس کے گھر پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اب بتاؤ! یہ انجینئری نہیں تو پھر اور کیا ہے؟

بندر میں بھی ڈاکٹر ہوتے ہیں۔ ایک واقعہ

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ مہتمم دار العلوم دیوبند نے اس موضوع پر ایک تقریر کی ہے، اس میں ایک واقعہ بیان کیا ہے، وہ یاد آ گیا۔

حضرت نے فرمایا: کسی علاقے میں بندر بہت ہوگئے تھے اور بندروں نے وہاں لوگوں کو پریشان کرنا شروع کردیا، کبھی حملہ کر دیتے تھے اور گھومتے تھے، پھرتے تھے، جس کی وجہ سے وہاں کے لوگ بہت پریشان ہوگئے اور گاؤں والوں نے مشورہ کیا کہ ان کو ختم کرنے کے لیے روٹیاں پکائی جائیں اور روٹیوں میں زہر گھول دیا جائے اور جب یہ بندر آئیں گے اور ان کو کھائیں گے، تو زہر کی وجہ سے وہ سب مر جائیں گے اور اس کے بعد ہمیں راحت مل جائے گی۔

چناں چہ ترکیب کی گئی، روٹیاں بنائی گئیں، اس میں زہر گھولا گیا اور پھر اس کے بعد جگہ جگہ روٹیاں پھیلا دی گئیں، کچھ چھتوں پر، کچھ سڑکوں پر، کچھ اِدھر اُدھر مختلف جگہوں پر یہ پھیلا دی گئیں۔ کہتے ہیں کہ وہ لوگ روٹیوں کو پھیلا کر انتظار میں بیٹھ گئے کہ اب بندر آئیں گے اور روٹیاں کھائیں گے اور مر جائیں گے۔

چناں چہ اپنے وقت پر بندر آئے، جب انہوں نے دیکھا کہ روٹیاں سب بکھری پڑی ہیں، تو اس سے ان کے دل میں کھٹک پیدا ہوگئی کہ کچھ نہ کچھ دال میں کالا ہے، سوچنے لگے کہ یہ روٹیاں ہم کو کھلانے کے لیے کیوں پکائی گئیں؟ یہ لوگ جو روزانہ ہم کو یہاں سے بھگانے کی فکر کرتے ہیں اور کبھی ہم کو کچھ نہیں کھلاتے، آج ہمارے ساتھ ان کی جانب سے یہ محبت و ہمدردی کیوں ہے اور یہ ہماری دعوت کیوں کی جارہی ہے؟

بھائیو! جو کبھی دعوت نہیں کرتا، وہ دعوت کرے، تو پریشانی ہوگی کہ نہیں؟ بخیل اچانک سخی کا کام کرنے لگے، تو اشکال ضرور ہوگا۔

اب بندروں نے اپنی عقل سے سمجھا کہ کچھ تو بات ہے۔ اب سارے بندر ٹھٹک گئے اور اپنی اپنی جگہ ٹھہر گئے؛ اس کے بعد ایک دو بندر آگے بڑھے، جو ان میں کے ڈاکٹر تھے، انہوں نے آگے بڑھ کر ان روٹیوں کو توڑا اور سونگھ سونگھ کر دیکھنے لگے کہ کیا

ہے؟اور وہ سمجھ گئے کہ اس کے اندر زہر ہے اور یہ ہم کو مارنے کے لیے دیا گیا ہے، پھر وہ دو چار بندر جو ٹسٹنگ (TESTING) کے لیے گئے تھے، انہوں نے واپس جا کر اشاروں میں دوسرے بندروں سے کچھ کہا اور پھر سارے بندر ان روٹیوں کو چھوڑ کر واپس چلے گئے۔ یہ دیکھ کر گاؤں کے لوگ سمجھے کہ ہماری تدبیر فیل(FAIL) ہوگئی اور بندر واپس جا چکے ہیں، لیکن کچھ ہی دیر میں پھر سارے بندر آ گئے اور سب کے ہاتھ میں یا منھ میں ایک پتا موجود تھا اور وہ پتا دراصل زہر کا تریاق یعنی اس کا توڑ تھا؛ ان بندروں کے بندر ڈاکٹروں نے ان کو بتا دیا تھا کہ ان زہریلی روٹیوں کے ساتھ اس کو استعمال کرو، تو یہ تمہارے لیے مضر اور نقصان دہ نہیں ہوں گی؛ بل کہ اس سے تمہیں فائدہ ہو جائے گا۔ اب وہ سارے بندر اس کو لے کر آئے اور روٹیوں کے ساتھ ملا کر کھانے لگے اور یہ سارے لوگ بیٹھ کر تماشا دیکھنے لگے، پھر سارے بندر کھا کر دندناتے ہوئے چلے گئے اور ان لوگوں کی بندروں کو مارنے کی تدبیر ناکام ہوگئی ۔ یہ واقعہ حضرت نے سنایا ہے کہ بندروں میں بھی ڈاکٹر ہوتے ہیں۔

الغرض! اس سے میں نے یہ بتانا چاہا کہ آداب کی تعلیم مدارس میں ہوتی ہے، بقیہ اسکولوں اور کالجوں میں جو تعلیم ہوتی ہے، وہ انسان بنانے کی تعلیم نہیں، انسانیت کی تعلیم نہیں؛ بل کہ وہ پیٹ بھرنے کی تعلیم ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک انسان کو انسان بننے کے لیے آداب کی رعایت کرنا بہت ضروری ہے، ان سب چیزوں کی رعایت کے بغیر وہ زندگی گذار دیتا ہے، تو وہ انسان کہلانے کا مستحق نہیں اور اس میں نمازیوں سے بھی بڑی غفلت ہو رہی ہے، اچھے اچھے لوگ متقی ہیں، پرہیزگار ہیں، بہت کچھ ہیں؛ لیکن اس کے باوجود ان باتوں کی کوئی رعایت نہیں کرتے۔

بھائیو! جزئیات تو بہت ہیں اور ساری جزئیات کو پیش کرنا مقصود بھی نہیں ہے؛ بل کہ متفرق جزئیات کچھ اِدھر کی اور کچھ اُدھر کی پیش کر کے بتانا یہ چاہتا ہوں کہ ادب کا ہمیں خاص الخاص لحاظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ اسلام کی تعلیم ہے اس کے بغیر کوئی انسان انسان نہیں بن سکتا۔

حضرت لقمان حکیم علیہ السلام نے ادب کیسے سیکھا؟

اب ایک سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ادب کہاں اور کیسے سیکھیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت لقمان حکیم سے کسی نے پوچھا: ''ادب از کہہ آموختی''؟ آپ نے ادب وتہذیب کس سے سیکھی؟ آپ کے اندر یہ سارے آداب کہاں سے آگئے، آپ نے یہ سب کس سے سیکھا؟ تو انہوں نے فرمایا: ''از بے ادباں'' میں نے یہ سب بے ادبوں سے سیکھا ہے، لوگوں نے کہا کہ عجیب بات ہے، لوگ تو علما سے نہیں سیکھتے، عالموں، فاضلوں سے نہیں سیکھتے اور آپ نے بے ادبوں سے سیکھ لیا؟ اور اتنے بڑے عالم اور اعلیٰ لیاقت کے حکیم بن گئے؟ یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا؟ انہوں نے کہا کہ بات دراصل یہ ہے کہ جب کوئی آدمی برائی کرتا، غلط کام کرتا، بے ادبی وگستاخی کی کوئی بات کرتا، کوئی کسی کو تکلیف دیتا، تو میں دل میں ٹھان لیتا کہ مجھے یہ کام نہیں کرنا ہے، میں اس طرح کسی کو تکلیف نہیں دوں گا، میں غلط نہیں کروں گا، اس طرح میں نے ادب سیکھا۔

اس سے ہم کو سبق حاصل کرنا چاہیے کہ جب کوئی ادب سیکھنا چاہتا ہے، مؤدب بننا چاہتا ہے، تو بے ادب سے بھی آداب سیکھ لیتا ہے اور اگر کوئی سیکھنا نہ چاہے، تو علما سے بھی نہیں سیکھ سکتا، مؤدب لوگوں سے بھی نہیں سیکھ سکتا۔

اللہ ہمارے اندر آداب پیدا فرمائے اور ہمیں انسان بنائے۔ آمین

اخلاق کے بغیر انسانیت نامکمل

باسمہٖ تعالیٰ

اخلاق کے بغیر انسانیت نامکمل

نحمدہٗ و نصلي علیٰ رسوله الکریم أما بعد:

فقد قال النبي صلی اللہ علیہ وسلم: ’’اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ‘‘ [البخاري: ۹]

(مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں)

گزشتہ مجلس میں یہ عرض کیا تھا کہ انسان بننے کے لیے تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے: ایک تحصیل آداب کی، دوسرے تکمیل اخلاق کی اور تیسرے حقوق ادا کرنے کی، آداب کی اہمیت اور انسانیت کے لیے اس کی ضرورت پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی تھی، اب یہ عرض کرنا ہے کہ انسانیت کے لیے دوسری اہم چیز اخلاق ہیں، جن سے انسان انسان بنتا ہے۔

اخلاق کیا چیز ہیں؟

اخلاق کیا چیز ہیں؟ اخلاق کا تعلق باطن سے ہے، جیسے آداب کا تعلق ظاہر سے ہے، باطن سے نہیں، اسی طرح اخلاق کا تعلق ظاہر سے نہیں ہے باطن سے ہے، دل ہمارا کیسا ہو؟ دل کے اندر ہمارے کس قسم کی باتیں ہوں اور دل کے اندر کس قسم کی باتیں نہ ہوں؟ جس سے کہ ایک انسان انسان بنتا ہے؟ یہ بھی ضروری ہے اور جب تک واقعی انسان کا اندرون نہیں بنتا، اس کا ظاہر نہیں بن سکتا، ظاہر بنانے کے لیے باطن کے بنانے کی ضرورت پڑتی ہے؛ اس لیے اپنے اندر اخلاق پیدا کرنا ضروری ہے۔

اور اخلاق ایسی چیز ہے، جس کی تعلیم سب دیتے ہیں، کافر بھی، عیسائی بھی، اچھے بھی، بُرے بھی؛ لیکن اسلام اس سلسلے میں سب سے آگے ہے اور اس میں بہت بڑا مواد اخلاق پر موجود ہے، حتیٰ کہ اسے ایک فن ہی بنا دیا گیا ہے، اس پر بے شمار کتابیں لکھی جا چکیں، قرآن وحدیث میں مختلف مقامات پر، مختلف انداز سے اس کی تعلیم ہے۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَاناً، أَحْسَنُهُمْ خُلُقاً''

(تم میں سے سب سے زیادہ کامل الایمان وہ ہے، جس کے اخلاق سب سے زیادہ اچھے ہوں) (الترمذي : ۱۱۶۲)

جس کے اخلاق عمدہ ہوں، سمجھ لو کہ اس کا ایمان بھی بڑا عمدہ ہے اور جس کے اخلاق عمدہ نہیں، سمجھ لو کہ اس کے ایمان کے اندر بھی بڑا کھوٹ ہے۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ''

(میں بلند اخلاق کی تکمیل کرنے کے لیے آیا ہوں)

(سنن البيهقي: ۲۰۵۷۱)

الغرض! اخلاق کا جاننا بہت ضروری ہے اور اس سے زیادہ ضروری اخلاق کا برتنا ہے، ایک انسان اخلاق جانتا ہے؛ لیکن خود اس کے اندر اخلاق نہ ہوں، تو بے فائدہ ہے۔

بوعلی سینا اخلاق ندارد

میں نے اپنے شیخ حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ سے یہ واقعہ سنا تھا کہ بوعلی

سینا، جو بہت بڑا حکیم گزرا ہے، اس کے زمانے میں ایک بزرگ تھے، اُنہوں نے ایک دفعہ بوعلی سینا کے بارے میں یہ کہہ دیا کہ بوعلی سینا اخلاق ندارد یعنی بوعلی سینا اخلاق نہیں رکھتا، یہ جملہ جب بوعلی سینا کو معلوم ہوا تو، اُس نے اخلاقیات پر ایک بہترین کتاب تصنیف کر دی، اور اس میں اخلاق کی تمام تفصیلات جمع کر دیا، اخلاق کے اصول و فروع، اخلاق کی اقسام وانواع، اخلاق کے آثار ولوازمات وغیرہ، سب کچھ لکھ دیا اور ایک نسخہ اُن بزرگ صاحب کے پاس بھی بھیجا، جنھوں نے یہ کہا تھا کہ ''بوعلی سینا اخلاق ندارد''، تو کسی نے ان بزرگ سے عرض کیا کہ حضرت! آپ نے کہا تھا کہ ''بوعلی سینا اخلاق ندارد''، اُس نے تو اخلاق پر اتنی زبردست کتاب لکھ کر بتا دیا کہ وہ اخلاق جانتا ہے، حضرت نے کہا کہ میں نے یہ کب کہا تھا کہ ''بوعلی سینا اخلاق نداند'' کہ بوعلی سینا اخلاق جانتا نہیں، میں نے تو یہ کہا تھا کہ ''اخلاق ندارد'' یعنی وہ اخلاق رکھتا نہیں، جاننا الگ بات ہے، رکھنا الگ بات ہے، کتاب لکھ دینا الگ بات ہے اور اُسے عملی جامہ پہنانا الگ بات ہے۔

ایک آدمی اخلاق کا علم رکھتا ہو، جان کاری رکھتا ہو؛ لیکن ہم اسے اس وقت تک با اخلاق نہیں کہیں گے جب تک اس کے اندر سے اخلاق ظاہر نہ ہوں، اس کے معاملات سے ظاہر نہ ہوں، لین دین سے ظاہر نہ ہوں، طور وطریقے سے ظاہر نہ ہوں لوگوں کے برتاؤ سے، میل ملاپ سے ظاہر نہ ہوں۔ ورنہ صرف کتاب لکھنے سے کتاب با اخلاق ہوگئی، صاحبِ کتاب نہیں ہوا، سارے اخلاق کے دروس تو کتاب میں ہیں، وہ تو انسان کے اندر ہونے چاہئیں۔

آج ہمارے اخلاق کا حال

لیکن آج ہمارے اخلاق کتنے برباد ہو چکے ہیں؟! دھوکہ بازی ہم لوگوں میں،

جھوٹ ہم لوگوں میں، بددیانتی کا مرض ہم لوگوں میں، لڑائیاں ہم میں، جھگڑے ہم میں، پولس اسٹیشنوں میں جاؤ، تو مسلمانوں کے کیسس (CASES) وہاں زیادہ ملیں گے اور کورٹوں میں آپ جاؤ مسلمانوں کے معاملات آپ کو زیادہ ملیں گے، بے شمار لڑائیاں، جھگڑے، پریشانیاں، ایک دوسرے کے ساتھ عداوت، ایک دوسرے کے ساتھ بغض، ایک دوسرے سے کینہ، ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش، یہ جو واہی تباہی چیزیں ہیں، یہ سب ہم میں موجود ہیں۔

عام طور پر آپ دیکھتے چلے جائیں، جتنے خائن ملیں گے، مسلمانوں میں ملیں گے، دھوکے باز آپ تلاش کرنے جائیں مسلمانوں میں آپ کو ملیں گے، جھوٹ بولنے والے مسلمانوں میں آپ کو ملیں گے، دھوکے بازی کا تو اتنا بازار گرم ہو گیا کہ جس کی کوئی حد و انتہا نہیں، ہر آدمی دوسرے کو دھوکہ دینے میں سمجھ رہا ہے کہ میں کامیاب ہوں، یہ بداخلاقی ہے، اخلاق نہیں ہیں۔

انسانی اخلاق تو یہ ہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ اچھے طریقے سے پیش آئے؛ لہٰذا دھوکے بازی سے بچنا اچھے اخلاق کا تقاضا ہے، جھوٹ سے بچنا اخلاق کا تقاضا ہے، سچ بولنا یہ اخلاق کا تقاضا ہے، لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا اخلاق کا تقاضا ہے۔

آج اخلاق کے بگڑ جانے کی وجہ سے ہم لوگ جانوروں سے بدتر ہو چکے ہیں؛ جانور شاید ہم سے اچھے ہوں؛ ہمارے اخلاق اُن سے بدتر ہیں، یہ سب اخلاقی اعتبار سے پستی و گراوٹ کا نتیجہ ہے اور اس کے علاوہ جو چیز ہم میں موجود ہونا چاہیے وہ ہم میں مفقود ہے، ہمدردی نہیں، غم خواری نہیں، رحم دلی اور کرم کا کوئی معاملہ نہیں ہے اور ایک دوسرے کو اوپر اٹھانے کی کوئی بات نہیں، گرانے کی بات تو بہت ہے، کوئی بھی

آدمی ذرا اوپر اٹھ رہا ہے، تو اسے گرانے کی فکر کریں گے۔

ایک لطیفہ

ایک لطیفہ مجھے یاد آ گیا، کہتے ہیں کہ باہر ملک کے کچھ لوگوں نے ایک کاروبار شروع کیا اور کاروبار تھا کیکڑوں کا، کیکڑا امام شافعی رَحِمَہُ اللہُ کے نزدیک تو اس کا کھانا جائز ہے اور امام اعظم ابو حنیفہ رَحِمَہُ اللہُ کے نزدیک اس کا کھانا حرام ہے۔

بہر حال! ان لوگوں نے ہر ملک سے کیکڑے منگوائے اور انڈیا سے بھی منگوائے؛ جب مال پہنچ گیا، تو اب ان میں سے ہر ملک کے کیکڑوں کی جانچ ہونے لگی کہ ذرا دیکھیں کون کیسا ہے اور کون کتنا موٹا اور تگڑا ہے؟ جب معائنہ ہونے لگا، تو ایک خاص بات یہ دیکھی گئی کہ ہر ملک کے کیکڑوں کو تو وہاں کے لوگوں نے پوری پیکنگ (PACKING) کے ساتھ روانہ کیا تھا؛ لیکن انڈیا سے جو کیکڑے آئے ہوئے تھے، ان کی کوئی خاص پیکنگ نہیں کی گئی تھی؛ بل کہ وہ صرف کھلے ڈبوں میں رکھ دیے گئے تھے ، لوگوں کو بڑا تعجب ہوا، تعجب دو وجہ سے ہوا ، ایک تو اس لیے کہ پیکنگ نہیں تھی دوسرے اس وجہ سے کہ کیکڑے پھر بھی ضائع ہوئے بغیر پہنچ گئے ہیں۔

انہوں نے ہندوستان والوں کو لکھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ تو جواباً انہوں نے لکھا کہ ہمیں اس بات کا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ کیکڑے باہر نکل جائیں گے اور ضائع ہو جائیں گے؛ کیوں کہ جب بھی کوئی کیکڑا باہر نکلنا چاہے گا، تو دوسرا کیکڑا اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچ لے گا؛ اس لیے ہم نے ان کی پیکنگ کا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا تھا۔

آج ہمارا حال ایسا ہی ہو گیا ہے کہ کوئی اوپر اٹھنا چاہتا ہے، ہم اس کی ٹانگ کھینچ دیتے ہیں کہ بھائی کہیں نہیں جانا ہے، کاروبار تیرا ترقی میں نہ آئے، علم تیرا ترقی میں نہ آئے ، چیزیں تیری ترقی میں نہ آئیں، جہاں تو ہے وہیں رہے گا، کہیں نہیں جائے

گا، بس یہیں پر جمارہے گا۔

یہ صورتِ حال ہم لوگوں کی ہوگئی ہے، یہ سب آپسی حسد، کینہ، کپٹ، بغض وعداوت اور ایک دوسرے سے ہمدردی کے نہ ہونے کا نتیجہ ہے، جس کی وجہ سے ہم ''انسان'' کہلانے کے مستحق نہیں رہ جاتے۔

ایک اچھے دوست کے اخلاق

کہتے ہیں کہ پہلے لوگوں کے اخلاق ایسے ہوتے تھے کہ ایک لڑکا اپنے ایک دوست کے ساتھ بڑا گہرا تعلق رکھتا تھا، ہمیشہ اس دوست کے ساتھ رہتا تھا، اس لڑکے کے باپ کو بہت پریشانی ہوئی اور اس کو بلا کر سمجھایا کہ اپنے وقت کو ضائع نہ کرو، ضائع کرنے کے بجائے کسی کام میں لگاؤ، وقت ضائع کرنا اچھی بات نہیں ہے؛ لیکن وہ لڑکا تھا کہ مانتا ہی نہیں تھا، ہمیشہ اس کے دوست کے ساتھ گھومتا پھرتا رہتا تھا۔

ایک دن باپ نے اس بیٹے کا دماغ درست کرنا چاہا، تو اس سے کہا: بیٹا! وہ جو تیرا فلاں دوست ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیرا بڑا گہرا دوست ہے؛ لیکن ذرا تو آزما کر تو دیکھ لے کہ وہ تیرا واقعی دوست ہے یا نہیں ہے۔ بیٹے نے کہا کہ میں کیسا اس کا امتحان لوں؟ اس کے باپ نے کہا کہ کسی موقع پر جا کر اس کو یہ بتانا کہ میرے باپ کو ایک دو ہزار روپیوں کی ضرورت پڑ گئی ہے، اگر تمہارے یا تمہارے باپ کے پاس ہوں، تو لے کر دے دو، لڑکے نے کہا ٹھیک ہے۔ اس کے بعد وہ اس کے گھر گیا اور اس کو بتایا، تو اس نے کہا کہ میں پوچھ کر بولوں گا، اب پھر جب اس سے پوچھنے گیا تو اس نے کہا کہ موقع نہیں ہوا، پھر بولوں گا، لڑکے نے کہا کہ کب بولو گے؟ تو اس نے کہا کہ دو دن بعد بولوں گا، پھر دو دن بعد پوچھا تو کہا کہ ابا جی کہہ رہے ہیں کہ سوچ

کر بولیں گے، بس اسی سوچ میں ایک مہینہ لگا دیا۔

ادھر باپ سنتا رہا، سنتا رہا اور پھر ایک دن اس سے کہا کہ دیکھو! یہ ہے تمہارا دوست، جو تمہاری ایک چھوٹی سی ضرورت پوری نہیں کر سکا، یہ آج کی دوستی کا حال ہے؛ لیکن میرا دوست کیسا ہے وہ بھی میں تجھ کو بتاتا ہوں، اس نے کہا ٹھیک ہے بتائیے۔ لڑکے کے باپ نے کہا کہ میرے ساتھ چلو۔ اب دونوں سفر کر کے رات کا کافی حصہ گزر جانے کے بعد دوست کے دروازے پر پہنچے اور دستک دی، اندر سے باپ کے دوست نے پوچھا کہ کون؟ اس نے بتایا کہ میں فلاں ہوں، ملنے آیا ہوں۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ دروازہ بہت دیر تک نہیں کھلا اور یہ باپ و بیٹا باہر کھڑے رہے اور سوچنے لگے کہ کیا ماحول کا اثر اس پر بھی ہو گیا ہے کہ دروازہ تک نہیں کھول رہا ہے!!! بہت انتظار کے بعد دروازہ کھلا اور دوست نے استقبال کیا اور بڑی آؤ بھگت کی اور اسے گلے لگایا اور حال اس کا یہ تھا کہ سر پر کپڑوں سے لدی گھڑی تھی اور ہاتھ میں روپیوں کی تھیلی تھی اور ایک جانب کو کھانا دستر پر لگا ہوا تھا، پھر پوچھا کہ کیسے اتنی رات میں تشریف لائے؟ کہا کہ بس ملنے آ گیا، مگر میرا سوال یہ ہے کہ آپ نے اس قدر تاخیر سے کیوں دروازہ کھولا؟ دوست نے کہا کہ میں نے جب تمہاری آواز سنی اور رات کا وقت دیکھا، تو سمجھا اس قدر رات میں آپ کسی خاص ضرورت ہی سے آئے ہوں گے، اس لیے میں نے ایک جانب یہ کھانے کا انتظام کیا ہے اور سر پر کپڑوں کی گھڑی ہے اور ہاتھ میں یہ روپیوں کی تھیلی ہے؛ لہٰذا اس انتظام میں دیر ہو گئی۔ آنے والے شخص نے کہا کہ دوست! بات یہ ہے کہ مجھے اس وقت اتنے روپیوں کی ضرورت ہے، اس لیے حاضری ہوئی ہے۔ اس نے کہا کہ یہ لو ہاتھ میں روپیوں کی تھیلی ہے، جس قدر چاہو، لے جاؤ، یہ کہہ کر رونے لگا، اس نے کہا کہ اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ کہا کہ میں کس قدر بدنصیب ہوں کہ آپ کو ضرورت پڑ

کر آپ کو میرے گھر آنا پڑا، میں اس سے پہلے آپ کو لا کر نہیں دے سکا، دوستی کا حق تو یہ تھا کہ میں آپ کے اور آپ کے گھر کے حالات کو جانتا اور خود پہنچ کر آپ کی ضرورت پوری کرتا؛ لیکن میں ایسا نہیں کر سکا، اس لیے معافی چاہتا ہوں، اللہ کے لیے مجھے معاف کر دیجیے۔

بیٹے نے یہ سارا منظر دیکھا اور اس کو اچھی طرح سمجھ میں آ گیا کہ ایک دوست وہ ہوتا ہے، جو صرف وقت کو ٹالنے کے لیے ہوتا ہے یا وقت گزاری کا ایک مشغلہ ہوتا ہے اور ایک دوست وہ بھی ہوتا ہے، جس کے دل کے اندر واقعی دوستی ہوتی ہے، ہمدردی ہوتی ہے اور جو ضرورت کے وقت اس کے کام آتا ہے۔

بھائیو! آج کا ماحول ایسا ہے کہ رشتہ داروں کے اندر سے رشتہ داری ختم، دوستوں کے اندر سے دوستانہ تعلقات ختم، ہمدردیاں ختم؛ بل کہ دوست آپس میں ایک دوسرے کو دھوکہ دے دیتے ہیں، ایسے واقعات ہمارے سامنے ہیں، یہ سب اخلاق کی کمی کا نتیجہ ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے اخلاق کو اچھے بنا لیں اور عزم کریں کہ ہم کسی کو دھوکہ نہیں دیں گے، ہم کسی کے ساتھ بدسلوکی نہیں کریں گے، ہم اچھائی ہی اچھائی کریں گے، ساری دنیا جیسا کیسا بھی کرے؛ لیکن ہم کبھی بدسلوکی نہیں کریں گے، یہ اسلام کی تعلیم ہے۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا انسان کو انسان نہیں کہا جا سکتا، انسان تو نام ہی اخلاق کا ہے، اگر اخلاق ہی انسان کے اندر نہ ہوں تو پھر کیا خاک اس کو انسان کہیں گے۔ آج ہم لوگوں کی بد اخلاقی اس قدر آگے بڑھ گئی ہے کہ غیر مسلم لوگ ہم سے کتراتے ہیں۔

مولانا محمد میاں صاحب رحمہ اللہ کے اخلاق

ہمارے بزرگوں میں حضرت مولانا محمد میاں صاحب رحمہ اللہ محدث

دارالعلوم دیو بند، ایک بڑی عظیم شخصیت گزری ہے، جو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ کے بھی اساتذہ میں سے ہیں۔ مفتی صاحب رحمۃ اللہ نے ان کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ جب کبھی حضرت آم کھاتے تھے، تو اس کے چھلکے جو جمع ہو جاتے تھے اس کو وہاں کے کوڑے دان میں نہیں ڈالتے تھے؛ بل کہ اس کو اٹھا کر وہاں سے بہت دور کسی جگہ لے جا کر ڈالتے، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ نے ایک موقعے پر ان سے پوچھا کہ حضرت! یہاں تو کوڑا دان ہے، یہیں ڈال دیں؟ فرمایا کہ نہیں، یہاں نہیں ڈالنا ہے، پوچھا کہ حضرت! اس میں کیا مصلحت ہے؟ تو فرمایا کہ میں جس محلے میں میں رہتا ہوں، یہ غریبوں کا محلّہ ہے، ان غریبوں کے محلے میں آم کھانے والے لوگ بہت کم ہوتے ہیں، اب مجھے اللہ کے فضل سے آم مل گئے اور میں نے آرام سے بیٹھ کر کھالیے، اگر وہ چھلکے میں نے باہر ڈال دیے، تو اس غریب محلے میں بسنے والے بچے اور نوجوانوں کی نظر ان چھلکوں پر پڑے گی، تو ان کے دل میں اس کی خواہش پیدا ہوگی اور میں اس کا باعث بنوں گا، میں نہیں چاہتا کہ اس کا باعث بنوں؛ اس لیے میں اسے یہاں نہیں ڈالنا چاہتا۔

اللہ والوں کے اخلاق بہت بلند ہوتے ہیں، یہ تو بہت ہی اونچے درجے کی بات ہے، غور کریں کہ یہ کتنے باریک اخلاق ہیں؟ اللہ اکبر!!

تواضع کے بغیر اخلاق نہیں

با اخلاق بننے کے لیے ویسے تو بہت سی صفات اپنے اندر پیدا کرنے کی ضرورت ہے؛ لیکن بنیادی طور پر اگر کوئی چار صفات سے اپنے آپ کو متصف کرلے، تو امید ہے کہ وہ با اخلاق بن جائے گا، بقیہ صفات انشاء اللہ ان چار کے ضمن

میں خود بخود پیدا ہو جائیں گے۔ وہ چار صفات یہ ہیں:

(۱) تواضع اختیار کرنا

(۲) اپنا حق چھوڑ دینا

(۳) معاف کرنا

(۴) لوگوں سے بھلائی کرنا

ان میں اول الذکر تواضع ہے اور تواضع کی صفت اخلاق کے باب میں ایک بہت ہی اونچی اور بھاری صفت ہے۔ تمام انبیائے کرام علیہم السلام کا، تمام بزرگوں کا، تمام مؤمنینِ کاملین کا ایک اعلیٰ درجے کا خصوصی وصف ہے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے:

﴿ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا ﴾ (رحمان کے بندے جب زمین پر چلتے ہیں، تو عاجزانہ انداز سے چلتے ہیں) [الفرقان:٦٣]

یہ اللہ کے بندے کون ہیں؟ اللہ کے بندے تو سبھی ہوتے ہیں، ابو جہل بھی اللہ کا بندہ ہے، فرعون بھی اللہ کا بندہ ہے؛ لیکن یہاں بندوں سے مراد اللہ کے مخصوص بندے، مقرب و نیک بندے ہیں کہ ان کی چال میں بھی عاجزی ہوتی ہے۔

معلوم ہوا کہ تواضع نیک لوگوں کا خصوصی وصف ہے، یہ ایک وصف انسان میں بہت ساری اچھائیاں پیدا کر دیتا ہے، یہ وصف انسان کے اندر رحم و کرم پیدا کرتا ہے، نرمی و ملاطفت پیدا کرتا ہے، اس کے مقابلے میں تکبر پیدا ہوگا، تو تکبر کے نتیجے میں بے شمار خرابیاں پیدا ہو جائیں گی۔

اسی تکبر کی بیماری کی وجہ سے آدمی دوستوں سے لڑتا ہے، جھگڑتا ہے، فساد کرتا ہے ظلم بھی کرتا ہے، تکبر ہی کے نتیجے میں آدمی دوسروں کا حق مار کر کھا جاتا ہے۔ ایسے ہی

انسان کو بداخلاق کہتے ہیں؛ اس لیے بااخلاق بننے کے لیے تواضع بہت ضروری ہے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی تواضع

حضرت حکیم الامت اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی تواضع کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ ایک صاحب حضرت سے ملنے آئے، جمعہ کا دن تھا، حضرت نماز پڑھانے اور خطبہ دینے کے لیے نکل رہے تھے، حضرت رحمہ اللہ عام لباس پہنے ہوئے تھے، اسی لباس میں تشریف لائے، تو وہ صاحب کہنے لگے: حضرت! آپ جمعہ کے لیے تشریف لے جارہے ہیں اور عبا نہیں استعمال فرمایا؟

عام طور پر جو پیشہ ور (PROFESSIONAL) خطیب حضرات ہوتے ہیں، وہ اپنے آپ کو کچھ بنا کر لاتے ہیں کہ قبا ہونا چاہیے اور عبا ہونا چاہیے وغیرہ؛ لیکن وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا، جو روزانہ کا لباس تھا، وہی لباس تھا؛ اس لیے وہ صاحب کہنے لگے کہ حضرت! آپ نے عبا زیب تن نہیں فرمایا؟ تو حضرت نے کہا کہ بھائی! وہ تو بڑے بڑے لوگوں کے لیے ہے، ہم جیسے لوگوں کے لیے کہاں ہے؟ وہ صاحب کہنے لگے کہ حضرت! آپ بھی تو بڑے ہیں، بہت سے علما کے استاذ ہیں، بہت سے مریدین کے شیخ ہیں، ہم سب کے لیے تو آپ بڑے ہیں، تو حضرت کی آنکھوں میں آنسو آئے اور ایک جملہ ارشاد فرمایا: ''حاجی صاحب! ابھی تو میرا ایک خلق بھی ٹھیک نہیں ہوا، میں کہاں بڑا ہوسکتا ہوں'' اللہ اکبر!

اس سے اندازہ کرو کہ ان کی تواضع کا کیا حال ہوگا؟ ایک اور موقعے پر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''میں بعض لوگوں کو ٹوکتا ہوں، بعضوں کی کسی بات پر سرزنش کرتا ہوں؛ لیکن اسی عین توبیخ وڈانٹ ڈپٹ کے وقت میں سمجھتا ہوں کہ میں بھنگی ہوں اور یہ شہزادہ ہے'' یعنی میں یہ سمجھ کر تنبیہ کرتا ہوں کہ مجھے یہ ذمہ

داری دی گئی ہے کہ تمہارے پاس علم ہے، تم اس کو بتاؤ، یہ میں اپنی ڈیوٹی (DUTY) پوری کرنے کے لیے کہتا ہوں؛ لیکن اسی وقت میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ یہ شہزادے کی طرح ہے، اللہ کا مقرب ہے، یہ نیک بندہ ہے۔ اندازہ کریں کہ ان کے اندر کی تواضع کا کیا عالم تھا؟ اس طرح اپنے اندر تواضع پیدا کریں۔

اسی طرح بہت سے بزرگوں نے اپنے آپ کو مٹایا، ایسا مٹایا، ایسا مٹایا، ایسا مٹایا کہ انہوں نے اپنا کوئی نام ونشان نہیں چھوڑا؛ لیکن جب انہوں نے اپنے آپ کو مٹایا، تو اللہ نے ان کو ایسا بانشان کر دیا کہ رہتی دنیا تک لوگ ان کو جانتے رہیں گے۔

جیسے حدیث میں آتا ہے اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا:

''مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَهُ اللّٰهُ'' (جو اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ اسے بلندیوں پر پہنچا دیتے ہیں''۔ (الترغیب والترھیب: ۳۷۳۳)

بھائیو! یہ ہے تواضع کہ جب آدمی میں تواضع ہو گی، تو آدمی کے اخلاق عمدہ ہوتے ہیں اور یہ بہترین قسم کا خُلق ہے کہ آدمی کے اندر تواضع پیدا ہو جائے۔ تواضع کیا ہے؟ اپنے آپ کو سمجھے کہ میں فقیر ہوں، حقیر ہوں اور لوگ میرے سے افضل ہیں اور میرے سے اعلیٰ ہیں، میں نماز پڑھ رہا ہوں اور میں روزہ رکھ رہا ہوں، تو یہ اللہ کی عنایت سے ہو رہا ہے، میرا کوئی کمال نہیں ہے۔ یہ پہلا وصف ہے۔

اپنے حقوق چھوڑ دینا- دوسرا خُلق

دوسرا خلق جو پیدا کرنے کی ضرورت ہے، وہ ہے اپنے حقوق کو چھوڑ دینا، دوسروں کے حقوق کو ادا کرنے کی فکر کرنا۔

یہ بھی بہت اعلیٰ درجے کا وصف ہے اور یہ وصف پیدا کب ہوگا؟ جب تواضع ہوگی، تواضع نہیں ہوگی تو یہ کبھی نہیں پیدا ہو سکتا، اگر متواضع آدمی کے دل میں یہ خیال

آئے کہ فلاں نے میرا حق ادا نہیں کیا، تو اندر سے دل معاً کہے گا کہ ٹھیک ہے، میں کونسا اتنا بڑا آدمی ہوں کہ میرا حق ادا کیا جائے؛ اگر کسی آدمی نے اس کے حق میں کوتاہی کردی، اس کے حق میں خلل ڈال دیا، تو یہ اس کو معاف کردے گا کہ چلو کوئی بات نہیں ہے اور دوسری طرف یہ کوشش کرے گا کہ میری طرف سے میں پورا پورا حق ادا کروں کہ اس میں کمی کوتاہی کبھی نہ ہونے پائے۔ اب بتاؤ کہ کتنا بھاری ہے یہ خُلق؟ کس قدر اعلیٰ درجے کی چیز ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اس طرح بنا لے کہ دوسروں کے حق کو ادا کرنے کی تو پوری فکر کرے اور اپنا حق معاف کرتا چلا جائے۔

ایک بزرگ کو کسی نے گالی دے دی، تو انہوں نے کہا: ''الحمد للہ'' اللہ کا شکر ہے، پھر کہا کہ گالی ہی تو دی ہے، میں تو اس قابل تھا کہ مجھے مارا پیٹا جائے۔ اسی طرح ایک اور بزرگ کا واقعہ ہے کہ کہیں جا رہے تھے، کسی نے ان کے اوپر راکھ ڈال دی، انہوں نے کہا: الحمد للہ! ان کے مریدین نے کہا کہ حضرت! یہ الحمد للہ کہنے کا کیا موقع ہے؟ یہ تو ''انا للہ'' پڑھنے کا موقع ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ نہیں بھائی! میرے لیے تو یہ الحمد للہ کا موقع ہے؛ اس لیے کہ میں تو اس قابل تھا کہ میرے اوپر آگ برسائی جاتی، یہاں تو راکھ ہی ڈالی گئی ہے۔

دیکھیے! تواضع اور عاجزی کے نتیجے میں انسان کس طرح اپنے حقوق چھوڑ کر درگزر کا معاملہ کرتا ہے۔

غیبت کرنے والے کو ہدیہ - ایک واقعہ

حضرت حسن بصری رَحِمَہُ اللہُ جو اپنے زمانے کے بہت بڑے محدث بھی تھے، فقیہ بھی تھے، صوفی اور بزرگ بھی، ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک آدمی ان کی غیبت کرتا تھا اور جب ان کو پتہ چلتا تھا کہ فلاں آدمی نے ایسا کہا، ویسا کہا، جب بھی

خبر پہنچتی، تو کوئی تحفہ بھیج دیا کرتے تھے، یہاں خبر پہنچی کہ اس نے آپ کو گالی دے دی یا آپ کی شان میں گستاخی کردی، تو انہوں نے فوراً کچھ نہ کچھ ہدیہ بھیج دیا، چند دن کے بعد اس کا منہ بند ہوگیا؛ اس لیے کہ اب یہاں سے تحفے برابر جاری ہیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: ''تَهَادُوْا تَحَابُّوْا'' کہ ہدیہ دیا لیا کرو محبت بڑھے گی۔

(مسند أبو يعلىٰ: ٦١٤٨، سنن بيهقي: ١٢٢٩٧، الأدب المفرد: ٥٩٤)

اب یہاں سے ہدایا جاتے رہے محبت پیدا ہوگئی اور اس نے غیبت کرنی چھوڑ دی؛ بل کہ اب آپ کی تعریف بھی کرنے لگا۔ جب غیبت چھوڑ دی، تو یہاں سے ہدیہ جانا بھی بند ہوگیا۔ کسی نے کہا کہ حضرت! وہ آدمی آپ کو گالی دیتا تھا، گستاخی کرتا تھا اور بُرا بھلا کہتا تھا اور آپ اسے ہدایا بھیجتے تھے اور اب وہ آدمی آپ کی تعریف کرنے لگا ہے، تو آپ نے ہدیہ بھیجنا چھوڑ دیا؟ انہوں نے کہا کہ بھائی! بات اصل میں یہ ہے کہ جب وہ شخص میری غیبت کرتا تھا، تو میرے اعمال نامے میں نیکیوں کا اضافہ کرتا تھا، اس کی نیکیاں میرے اعمال نامے میں آجاتی تھیں، اتنا بڑا کام وہ کرتا تھا، تو میں بھی اس کو ہدیہ دیا کرتا تھا، اب اس نے میری غیبت کرنی چھوڑ دی، تو مجھے نیکیاں آنی بھی بند ہوگئیں؛ اس لیے میں نے بھی ہدیہ دینا چھوڑ دیا۔

اللہ اکبر! یہ کیسے اخلاق ہیں؟ اندازہ کرو! یہ عظیم خلق ہے کہ اپنے حق کو آدمی چھوڑ دے؛ لیکن دوسرے کے حق کو برابر ادا کرتا رہے؛ اس کے اندر کوئی کمی یا کوتاہی آنے نہ دے، بیوی سے پریشانی ہوجائے وہی کام کرے، دوست سے تکلیف ہوجائے وہی کام کرے، رشتہ داروں سے کوئی بات پیش آجائے وہی کام کرے، دوسروں کا حق معاف کردے۔ ہمیں یوں کہنا چاہیے کہ آپ مجھے سلام نہیں کرتے کوئی مضائقہ نہیں، میں ہی سلام کرتا ہوں، آپ مجھے کیر (CARE) نہیں کرتے،

تو ٹھیک ہے، میں آپ کا پوری طرح خیال رکھتا ہوں۔ ہم اگر یہ روش پیدا کرلیں، تو یہ بہت اونچے درجے کا وصف ہے۔

معاف کرنا- تیسرا خُلق

تیسرا وصف وخلق یہ ہے کہ کوئی کچھ بھی کرے، ہم معاف کردیا کریں، یہ معاف کرنا انسان کا بہت اہم خلق ہے؛ لیکن ہم لوگ آج عام طور پر معاف کرنے کو بھول چکے ہیں، حال آں کہ قرآن، حدیث میں معاف کرنے کی تعلیم دی گئی ہے، ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا﴾ (معاف کرو اور درگزر کرو)

[البقرۃ: ۱۰۹]

یہ حکم کافروں کے حق میں دیا گیا ہے کہ اے نبی! اے مسلمانو! کافروں کو معاف کردو۔ اندازہ کرو کہ جو اللہ تعالیٰ کافروں کو معاف کرنا سکھا رہے ہیں کیا وہ اللہ بیوی کو معاف کرنا نہیں سکھائیں گے؟ جو اللہ کافروں کو معاف کرنا سکھا رہے ہیں، وہ اپنے بچوں، اپنے والدین، اپنے رشتہ دار اور اپنے دوست و احباب کو معاف کرنا نہیں سکھائیں گے؟

ایک جگہ قرآن میں ارشاد ہے:

﴿وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا، أَلَا تُحِبُّوْنَ أَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾

(مؤمنوں کو چاہیے کہ معاف کریں، درگذر کریں، کیا تمھیں یہ پسند نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کردے) [النور: ۲۲]

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر منافقین نے تہمت لگائی تھی، ان منافقین کے ساتھ تین مسلمان بھی شریک ہوگئے تھے، ان میں

حضرت مسطح رضی اللہ عنہ بھی تھے، جو غریب بھی تھے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے قریب یعنی رشتہ دار بھی تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کا خرچ برداشت کرتے تھے، جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ حضرت مسطح رضی اللہ عنہ بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگانے میں شریک ہیں، تو آپ ان پر غصہ ہوئے اور قسم کھالی کہ ان پر خرچ نہیں کروں گا۔

مگر اللہ تعالیٰ کو یہ ادا پسند نہ آئی، اللہ تعالیٰ نے اس طرح قسم کھانے سے منع کیا اور فرمایا: ''کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ تمہارے معاف کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بھی تمہارے گناہوں کو معاف کردے''؟۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس آیت کو سن کر فوراً کہا ''وَاللّٰهِ إِنِّي أُحِبُّ أَنْ يَّغْفِرَلِيْ ''(خدا کی قسم! مجھے یہ بات پسند ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے گناہوں کو معاف کردے)

قرآن کی انہیں تعلیمات پر عمل کرتے ہوے معاف کرنے والوں نے بڑی بڑی باتوں کو معاف کیا، انبیا کرام علیہم الصلوۃ والسلام نے بڑی بڑی باتوں کو معاف کیا، اسی طرح ہمارے اکابر اولیاء اللہ نے بڑی بڑی باتوں کو معاف کیا؛ لیکن آج چھوٹے چھوٹے مسائل میں ہمارے دلوں میں اختلافات پیدا ہوجاتے ہیں اور ان اختلافات کو بنیاد بنا کر لڑائیاں، جھگڑے، فسادات اور آگے تک کارروائیاں چلتی رہتی ہیں، کورٹوں کچیریوں میں کیس چلتا ہے؛ میرے سامنے ایسے بھی واقعات آئے کہ باپ بیٹے کا کیس چل رہا ہے، بھائی بھائی کا کیس چل رہا ہے۔

اس سے اندازہ کریں کہ آج ہمارے اندر کس قدر کمی ہے اخلاق کی؟ معاف کرنے کی صفت کی؟ ہمارے اندر یہ صفت باقی نہیں ہے، یہ صفت پیدا کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت سے معافی کا درس

قرآنِ کریم میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ تفصیل سے آیا ہے، جس میں ان کی ایک عظیم صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے ان بھائیوں کو معاف کردیا، جنھوں نے ان کو بچپن میں کنویں میں پھینک دیا تھا، جب حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے وزیرِ مالیات بنادئے گئے، توان کے بھائی راشن لینے ان کے پاس پہنچے، حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے پوچھا کہ تم نے یوسف کے ساتھ جو حرکت کی اسے جانتے ہو؟ سارے بھائی گھبرا گئے کہ اتنے سالوں کا یہ راز ان کو کیسے معلوم ہو گیا؟ فوراً سوال کیا، کیا آپ ہی یوسف ہیں؟ حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: ہاں! میں یوسف ہوں اور یہ بنیامین میرا بھائی ہے۔ تمام بھائی ڈر گئے کہ پتہ نہیں آج ہمارے ساتھ کیا معاملہ کریں گے؛ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

﴿لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ﴾ تم پر آج کوئی الزام نہیں، اللہ تمھیں معاف کرے۔

دیکھیے! کتنا بڑا واقعہ ہے، کیا اس سے بڑا کوئی واقعہ ہوسکتا ہے؟ وہ بھائی جو حضرت یوسف علیہ السلام کو قتل کرنا چاہتے تھے، ان کو فوراً معاف کردیا؛ بل کہ پہلے ہی معاف کردیا تھا، اب اس کا اظہار کررہے تھے؛ اسی لیے ان کے بھائیوں کو راشن بھر بھر کردے رہے تھے اور اس پر کوئی معاوضہ بھی نہیں لیا۔

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فتحِ مکہ کے موقعے پر جب کہ سارے کفار و مشرکین موجود تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے غلاموں کی طرح کھڑے ہوئے تھے، ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بتاؤ! آج میں

تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں؟ سب نے کہا آپ رحیم ہیں، شفیق ہیں، آپ سے شفقت ہی کی امید ہے۔آپ نے فرمایا: میں آج وہی کہوں گا، جو میرے بھائی یوسف علیہ السلام نے کہا تھا، جاؤ، تم سب کے سب آزاد ہو، اور تم پر کوئی الزام نہیں۔

اس واقعے سے ہمیں عبرت لینا چاہیے، سبق حاصل کرنا چاہیے، ہمارا حال یہ ہے کہ ہم چھوٹی چھوٹی بات کو معاف نہیں کرتے ،معافی کے سبق کو ہم نے بھلا دیا ہے، اتنا بھلایا ہے کہ دور دور تک لوگوں کے معاف کرنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی ، بعض وقت لوگ آپس کے اختلاف پر ایک دوسرے کو کہہ دیتے ہیں کہ میرے مرنے پر بھی تم مت آنا ۔ایسا نہیں ہونا چاہیے ؛بل کہ ہمیں بھی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح اور حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح ''لَاتَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ ''(تم پر کسی قسم کا مؤاخذہ نہیں) دہرانا چاہیے۔

یہ معاف کرنے کی صفت تیسرا خلق ہے، جو بااخلاق بننے کے لیے نہایت ضروری ہے، اس کے بغیر اخلاق کا کوئی سوال نہیں۔

دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنا- چوتھا خلق

ایک اور خلق جو بہت اعلیٰ درجے کا ہے، وہ یہ ہے کہ آدمی دوسروں کے ساتھ بھلائی کرے، یہ صفت ماقبل کی صفت سے بھی اعلیٰ درجے کی چیز ہے۔

اور یہ بھلائی کرنا دو طرح ہوتا ہے: ایک یہ کہ دوسروں سے تکلیف واذیت کی چیزوں کو دور کرے، اس کی کوئی مصیبت و پریشانی ہے، تو اس کو دور کرنے کی کوشش کرے ۔دوسرے یہ کہ ان کی ضروریات وحاجات میں ان کا ساتھ دے، اس کو روپیے کی ضرورت ہے، تو روپیے دے، کپڑے کی ضرورت ہے، تو کپڑا دے۔

حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

"اَلْإِیْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَةً ، فَأَفْضَلُهَا لَاإِلٰه إِلَّااللّٰهُ وَأَدْنَاهَا إِمَاطَةُ الْأَذیٰ عَنِ الطَّرِیْقِ"

(ایمان کے ستر سے کچھ زائد شعبے ہیں، ان میں سے اعلیٰ درجے کا شعبہ ہے، "**لاإله الله محمد رسول الله**" کی گواہی دینا اور ادنیٰ درجے کا شعبہ، راستے سے تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا ہے) (مسلم :۱۲۶)

اس میں کتنا بڑا خُلق سکھایا ہے کہ مؤمن کے اندر انسانیت اگر کامل ہے، تو جہاں پر وہ "**لاإله إلاالله**" پڑھتا ہے، اللہ پر یقین رکھتا ہے، وہیں دوسروں کو تکلیف سے بچانے کی فکر بھی کرتا ہے۔

مثلاً آپ ایک راستے سے جارہے ہیں، راستے پر کانٹے پڑے ہیں یا وہاں کوئی گڑھا ہے، تو جب تک آپ ان کانٹوں کو راستے سے ہٹا نہ دیں، یا اس گڑھے پر کوئی چیز رکھ کر اس کو بند نہ کردیں، وہاں سے آگے نہ بڑھیں۔

راستے میں آپ نے دیکھا کہ اذیت دینے والی چیز موجود ہے، اس کو وہاں سے ہٹانے کی فکر کریں؛ کیوں کہ یہ ایمان کا بھی تقاضا ہے اور اخلاق کا بھی تقاضا ہے۔ یہ ہے بھلائی کہ آدمی دوسروں کی بھلائی کو سوچے؛ لیکن اب الٹا یہ ہوتا ہے کہ لوگ اپنی طرف سے لالا کر سڑکوں پر، راستوں پر تکلیف دہ چیزیں ڈال دیتے ہیں، حال آں کہ یہ منع ہے۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

"**اِتَّقُوْا اللَّاعِنَیْنِ**" کہ دو لعنت والے کاموں سے بچو

صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ لعنت والے دو کام کیا ہیں؟ تو

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "الَّذِي يَتَخَلّٰى فِي طَرِيْقِ النَّاسِ أَوْ فِي ظِلِّهِمْ" (ایک یہ کہ لوگوں کے راستے میں پیشاب پاخانہ کرے اور دوسرے یہ کہ لوگوں کی بیٹھکوں میں پیشاب پاخانہ کرے)

(مسلم: ۶۴۱، ابو داؤد: ۲۵، مسندأحمد: ۸۸۴۰،

سننِ بیهقي: ۴۷۹، مستدرک: ۶۶۴)

بیٹھکوں سے مراد جہاں پر عام طور سے لوگ آتے ہیں، بیٹھتے ہیں، کچھ بات چیت کرتے ہیں، جیسے درخت کا یا کسی اور چیز کا سایہ، اب ایسی جگہ کوئی جا کر پاخانہ کر دے، یا کوئی اور گندگی ڈال دے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کی اس پر لعنت ہوتی ہے، وجہ کیا ہے؟ وجہ وہی ہے کہ اس سے دوسروں کو تکلیف ہو رہی ہے، مؤمن تو بھلائی چاہتا ہے، اذیت ناک چیزوں کو ہٹاتا ہے، برائی کو ہٹاتا ہے، صفائی کرتا ہے۔

حضرت شیخ الاسلام مدنی رحمہ اللہ کا حیرت انگیز واقعہ

ایک واقعہ سنتے چلیے، ہمارے اکابر کیسے تھے اور ان کے اخلاق کا کیا عالم تھا؟! اس سے یہ بھی معلوم ہو جائے اور یہ بھی کہ وہ حضرات حدیثوں پر کیسے عمل کرتے تھے؟ واقعہ یہ ہے کہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ ایک مرتبہ ٹرین سے سفر فرما رہے تھے اور آپ جس کمپارٹمنٹ میں بیٹھے تھے اسی میں ایک غیر مسلم جنٹل مین بھی سوار تھے، اسی اثنا میں وہ صاحب اٹھے اور استنجا خانے کی طرف گئے، دروازہ کھولا اور پھر فوراً ہی واپس آ کر اپنی جگہ بیٹھ گئے، کچھ دیر بعد پھر اٹھے اور استنجا خانے کے دروازے تک جا کر اندر دیکھا اور آ کر بیٹھ گئے، پھر اٹھ کر ٹہلنے لگے اور ان کے

طرزِ عمل سے لگتا تھا کہ وہ بہت پریشان و بے قرار ہیں۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ ان کے اس حال کو دیکھ کر سمجھ گئے کہ ان کو بیت الخلا جانے کی سخت ضرورت ہے؛ مگر کسی وجہ سے وہ جا نہیں پا رہے ہیں، اس لیے بے قرار ہیں۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھے اور بیت الخلا کی جانب گئے اور دروازہ کھولا، دیکھا کہ کسی نالائق نے پاخانہ کر کے ساری گندگی استنجا خانے میں اِدھر اُدھر پھیلا رکھی ہے۔ حضرت سمجھ گئے کہ اسی کی وجہ سے یہ صاحب پریشان ہیں؛ پھر حضرت نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کر اندر سے کنڈا لگالیا اور اپنے ہاتھوں سے ساری غلاظت و گندگی صاف کی اور بیت الخلا کو دھویا اور باہر آئے، پھر ان صاحب سے پوچھا کہ آپ کو کوئی ضرورت ہے؟ پریشان لگ رہے ہیں، انھوں نے کہا کہ اصل میں مجھے استنجا کے لیے جانا تھا؛ مگر یہاں کا استنجا خانہ بہت گندہ ہے، اس لیے جا نہیں پا رہا ہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ اب تو صاف ہے تشریف لے جایئے۔ یہ کہہ کر ان کو ان کی ضرورت کے لیے نظم کر دیا۔

یہ واقعہ کس قدر عبرت خیز ہے! حضرت مدنی رحمۃ اللہ جیسا عظیم محدث، دارالعلوم دیوبند کا شیخ الحدیث اور دنیائے اسلام کا شیخ الاسلام حدیثِ نبوی پر عمل کر کے بتا رہا ہے: "أدناها إماطة الأذىٰ عن الطريق" (ایمان کا ادنیٰ مقام یہ ہے کہ راستے سے تکلیف دینے والی چیز کو دور کر دو)۔

بھائیو! ہمیں یہ سب سیکھنا چاہیے اور ہماری طرف سے پوری کوشش ہونی چاہیے کہ پوری انسانیت کے لیے بھلائی ہی بھلائی ہو، راستے کی بھلائی اور ان کے ساتھ سلوک کی بھلائی، ان کے ساتھ بات چیت کے اعتبار سے بھلائی۔

اسی طرح ایک یہ ہے کہ کسی کو کوئی کام پڑ گیا اور اس کام میں ہم اس کا ہاتھ

بتائیں اس کی ضرورت کو پورا کریں؛ جیسے حدیث میں آتا ہے اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا:

"مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ، وَ مَنْ يَسَّرَ عَلَى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ ، وَاللّٰهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أَخِيهِ"

(جو شخص کسی مؤمن کی دنیا کی پریشانیوں میں سے کسی پریشانی کو دور کرتا ہے، اللہ اس کی قیامت کی پریشانیوں میں سے کوئی پریشانی دور فرماتے ہیں اور جو کسی تنگ دست پر آسانی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر دنیا و آخرت میں آسانی کرتے ہیں اور جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرتا ہے اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی پردہ پوشی فرماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندے کی مدد فرماتے رہتے ہیں، جب تک وہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے)

(مسلم: ۷۰۲۸، أبو داود: ۴۹۴۸، ترمذي: ۲۹۴۵، ابن ماجه: ۲۲۵، أحمد: ۷۴۲۱)

معلوم ہوا کہ انسان جب تک ایک انسان کی بھلائی میں لگا رہے گا، اللہ بھی اس سے بھلائی کرے گا، اس کے کاموں کو بنائے گا۔

ہر عہدہ و منصب بھلائی کے لیے ہے

بعض لوگ بعض ڈیپارٹمنٹوں، جو (DEPARTMENTS) سرکاری یا غیر سرکاری سے تعلق رکھتے ہیں، لوگ ان کے پاس جاتے ہیں کہ ہمارا یہ کام ہے، یہ کام کر دیجیے، تو یہ لوگ کام بنانے کے بجائے کام بگاڑنے کی کوشش میں لگے رہتے

ہیں، جب تک کہ ان کو کچھ نہ دے دیا جائے۔کوئی فائل (FILE) آگے نہیں بڑھاتے، اس کام کو کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔

مؤمن وہ ہوتا ہے، جو ساری دنیا، ساری انسانیت کے لیے بھلائی کا کام کرتا ہے، اس کے اندر نیک خواہشات اور نیک جذبات ہوتے ہیں، ہمدردی کا عنصر اس کے اندر رہتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ ساری دنیا کے لیے بھلائی کا کام کروں، اس لیے کہ اللہ نے مجھے یہ منصب دیا، عہدہ دیا، تو میں اس کے ذریعے بھلائی کا کام کروں، یہ آدمی کے دل میں ہونا چاہیے۔

اسی طرح ایک اور مثال ہے کہ اللہ نے کسی کو ڈاکٹر بنا دیا، اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، اب وہ ڈاکٹر لوگوں کی بھلائی کو سوچے کہ میری طرف سے جس قدر بھلائی کا کام میں کرسکتا ہوں کرتا چلا جاؤں، بیماروں کو فائدہ ہو، ان کے لیے سہولیات ہوں، ان کے لیے آرام ہو۔ دیکھیے! اس عنصر کے پائے جانے کی وجہ سے وہ بڑا با اخلاق ڈاکٹر ہے اور جو صرف پیسے لینے کے لیے کام کرنے لگے، تو ایسے ڈاکٹر کو آپ کیا کہیں گے؟ وہ کوئی اچھا ڈاکٹر نہیں، ہاں! اپنی ضرورت کے لیے اور اپنی زندگی گذارنے کے لیے جس قدر لے سکتا ہے لے، یہ منع نہیں ہے؛ لیکن اب ہوتا یہ ہے کہ ڈاکٹر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ لوگوں کو مجبور کر کے پیسہ کمائیں، ہمدردی کا جذبہ کم، کمانے کا جذبہ زیادہ، لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک کم، ان سے روپیہ لوٹنے کا معاملہ زیادہ۔ یہ بات مؤمن کی شان کے بالکل خلاف ہے، مؤمن چاہتا ہے کہ میں بھلائی ہی بھلائی کرتا رہوں۔

بھائیو! یہ چند موٹی موٹی باتیں ہیں کوئی دقیق باتیں نہیں؛ لیکن ان کا ذکر اس لیے کرنا پڑا کہ یہ اسباق ہم بھول گئے، معاف کرنا ہم بھول گئے، دوسروں سے ہمدردی کرنا ہم بھول گئے، غم خواری کے جذبے کو ہم بھول گئے۔

الغرض! یہ چار خُلق جو بھی انسان اپنے اندر پیدا کرلے، اس کے اندر تواضع ہو، اس کے اندر اپنے حقوق چھوڑ دینے کی صفت ہو، معاف کرنے کا جذبہ ہو، بھلائی کرنے کی عادت ہو، تو اللہ کی ذات سے امید ہے کہ وہ بااخلاق بن جائے گا۔

حقوق العباد
کی اہمیت

باسمہ تعالیٰ

حقوق العباد کی اہمیت

نحمدهٗ ونصلي علیٰ رسوله الكريم أما بعد :

فقد قال النبي ﷺ : ”اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ“ [البخاري: ۹]

(مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں)

انسان بننے کے لیے ایک تو ادب ضروری ہے اور دوسرے اخلاق کا ہونا ضروری ہے، جس سے انسان انسان بنتا ہے۔ تیسری چیز میں نے بتائی تھی، حقوق کا ادا کرنا، جب ایک انسان دوسرے انسان سے کسی نہ کسی حیثیت سے متعلق ہوتا ہے، باپ کے اعتبار سے، چچا کے اعتبار سے، شوہر کے اعتبار سے، بیوی کے اعتبار سے، کسی نہ کسی حیثیت سے تعلق پیدا ہوگا، تو اس تعلق کے اندر ضروری ہے کہ انسان سب کے حقوق ادا کرے، ماں باپ کے حقوق ادا کرے، بچے ہیں تو بچوں کے حقوق ادا کرے، شوہر ہے، تو بیوی کے حقوق ادا کرے، بیوی ہو تو شوہر کے حقوق ادا کرے، بھائی بھائی کا حق ادا کرے، بہن کا حق ادا کرے، اس طرح دنیا کے کسی بھی انسان سے کسی بھی طرح کا تعلق قائم ہو جائے، تو اس کا اس کی حیثیت سے حق ادا کرے۔

یہ بھی دین کا بڑا اہم ترین شعبہ ہے اور انسانیت کا بھی شعبہ ہے؛ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ جو جتنا بڑا انسان ہوگا، کامل انسان ہوگا، وہ اسی قدر پکا مؤمن ہوگا؛ ورنہ جو آدمی ماں باپ کا حق ادا نہ کرتا ہو، تو کیا آپ اس کو پکا مؤمن کہیں گے؟ جو بیوی شوہر کا حق ادا نہ کرے، کیا اس کو کامل مؤمنہ کہا جائے گا؟ اور اگر کوئی صاحب اپنی

بیوی کے حقوق ادا نہ کرتے ہوں، تو کیا ان کو کامل مؤمن سمجھا جائے گا؟ نہیں! جیسے نماز نہ پڑھنے والے کو آپ کامل مؤمن نہیں سمجھتے، اسی طرح ان حقوق کے ادا نہ کرنے والے کو بھی کامل مؤمن نہیں سمجھا جا سکتا۔

لیکن اس میں آج اتنی بڑی کوتاہی ہوتی ہے کہ بعض لوگ نمازی ہو جاتے ہیں، پرہیزگار ہو جاتے ہیں اور تہجد گذار ہو جاتے ہیں، ذاکر وشاغل بھی ہو جاتے ہیں؛ لیکن اس کے باوجود حقوق ادا کرنے کا جہاں مسئلہ آتا ہے، تو بالکل ٹھپ ہو جاتے ہیں، حق ہی ادا نہیں کرتے، ماں باپ کا حق کھا جاتے ہیں اور کوئی بھائی بہنوں کا حق کھا جاتا ہے، اس طریقے پر حقوق کی ادائے گی کے سلسلے میں بڑی کوتاہی واقع ہوتی ہے، اس سے ایک آدمی جس طرح کامل مؤمن نہیں بن پائے گا، وہ کامل انسان بھی نہیں بن پائے گا۔

معاشرتی زندگی کے دو اصول

حسنِ معاشرت کی تعلیم، جو قرآن وحدیث میں دی گئی ہے، دو اصولوں پر مبنی ہے: ایک یہ کہ جس انسان کا جو حق شریعت نے بتایا ہے اس کو وہ حق پورا پورا دیا جائے، والدین کا حق، استاد کا حق، شوہر کا حق، بیوی کا حق، اولاد کا حق، رشتہ داروں کا حق، پڑوسیوں اور دوستوں کا حق وغیرہ۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ اپنا حق معاف کر دے اور اس سلسلے میں حسنِ اخلاق سے پیش آئے۔

عام طور پر دنیا میں جو فساد و جھگڑا ہوتا ہے وہ ان اصولوں کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہوتا ہے؛ کیوں کہ لوگ اپنا حق وصول کرنے پر تو پورا زور لگاتے ہیں، مگر دوسروں کا حق ادا کرنے کا نمبر آتا ہے، تو معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے، سمجھتے ہیں کہ مجھے کسی کا

حق ادا کرنا ضروری نہیں، بیٹا چاہتا ہے کہ باپ اس کا پوارا پورا حق ادا کرے؛ مگر یہ باپ کا حق ادا کرنا نہیں چاہتا، اس کی فکر نہیں کرتا، شوہر چاہتا ہے کہ بیوی اس کا پورا پورا حق ادا کرے؛ مگر یہ بیوی کا حق ادا کرنا نہیں چاہتا، اس کی فکر نہیں کرتا، اسی طرح سب لوگ چاہتے ہیں، اب بتائیے اگر ایسا رہا، تو معاشرتی زندگی میں نکھار کیوں کر آسکتا ہے؟ معاشرے کی اصلاح کیسے ہوسکتی ہے؟

اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم دوسروں کے حقوق ادا کرنے کی فکر کریں، ہمارے حقوق چاہے کوئی ادا کرے یا نہ کرے۔

قرآن میں والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم

والدین سے انسان کا تعلق پیدائش سے پہلے سے قائم ہوجاتا ہے، جب کہ وہ ابھی باپ کی صُلب میں منی کے قطرات کی شکل میں تھا اور پھر وہاں سے منتقل ہوکر رحمِ مادر میں قرار پکڑا؛ اسی لیے اللہ ورسول کے بعد پوری کائنات میں سب سے بڑا کسی کا حق انسان پر ہے؟ والدین کا حق ہے۔ اسلام نے ان کے حقوق پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

قرآنِ کریم میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ نے والدین سے حسنِ سلوک کی تعلیم دی ہے، اور کئی جگہ اللہ نے توحید کے بیان کے بعد متصلاً والدین کے حقوق کا ذکر کیا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوْٓا إِلَّآ إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَآ أَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ أُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا﴾

(اور تمہارے پروردگار نے یہ حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اگر والدین میں سے کوئی ایک یا دونوں تمہارے پاس بڑھاپے کو پہنچ جائیں، تو انہیں اُف تک نہ کہو اور نہ انہیں جھڑکو؛ بل کہ ان کے ساتھ عزت سے بات کیا کرو اور ان کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرتے ہوئے ان کے سامنے اپنے آپ کو انکساری سے جھکاؤ اور یہ دعا کرو: ''یارب! جس طرح انہوں نے مجھے میرے بچپن میں پالا ہے، آپ بھی ان کے ساتھ رحمت کا معاملہ کیجیے)

[بني إسرائيل: ۲۳، ۲۴]

اس آیت میں والدین کے کئی حقوق بتائے گئے ہیں: ان کے ساتھ ہر حال میں حسنِ سلوک کرنے کا حکم ہے، ان کی طرف سے اچھا سلوک ہو، تب بھی اور اگر والدین کی طرف سے کوئی بات ایسی پیش آجائے، جو تمہارے مزاج کے خلاف ہو، تب بھی تم خاموش رہو، برداشت کرو، کچھ نہ کہو، جھڑکی مت دو، فقیر کو بھی جھڑکی دینا شریعت میں جائز نہیں ہے، تو والدین کو جھڑکی دینا کیسے جائز ہوسکتا ہے؟

والدین کی طرف سے خلافِ طبیعت بات پیش آئے، تو بھی برداشت کرنا ہے؛ کیوں کہ ایک زمانہ وہ تھا، جس میں والدین بچے کی طرف سے ہونے والی ہر تکلیف کو برداشت کرتے تھے، جب بچہ چھوٹا تھا، رات رات بھر بچہ روتا تھا، والدین اس کے لیے جاگتے تھے اور ناراض بھی نہیں ہوتے تھے، خوشی خوشی اس تکلیف کو برداشت کرتے؛ بل کہ تکلیف ہی نہیں سمجھتے تھے، کبھی ان پر غلاظت وگندگی کرتا تھا، ماں بڑے پیار سے اس کی صفائی کرتی تھی، ماں اپنے پیٹ میں نو ماہ اسے رکھی رہی، بوجھ کو اٹھایا، پھر ولادت کے وقت دردِ زہ کو سنبھالا۔ یہ سب کچھ اور بھی بہت کچھ کیا بچے کے لیے؛ اس لیے اب بچے کو حکم ہے کہ وہ والدین کو برداشت کرے، اُف تک نہ

کہے، جھڑکی نہ دے، بالخصوص جب وہ دونوں یا ان میں سے کوئی بڑھاپے کو پہنچ جائے، تو ان سے نرمی سے بات کرنے کا اور اچھی طرح بات کرنے کا اور ان کے سامنے عاجزی وتواضع اختیار کرنے اور ان کے آگے بچھ جانے کا حکم دیا ہے۔

یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ ان کے حق میں دعا کی جائے، وہ دعا بھی سکھلائی گئی ہے کہ یوں کہے: اے اللہ! اُن پر رحم فرما جیسا کہ انہوں نے بچپن میں بڑے رحم کے ساتھ میری پرورش کی ہے۔ اس دعا میں والدین کی خدمات کا اعتراف بھی ہے اور ان کے لیے دعا کا التزام بھی ہے۔

لیکن آج بچہ بڑا ہو کر ماں باپ کے سارے حقوق کو بُھلا بیٹھتا ہے، اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے، ان کو حقیر جانتا ہے، خود کو عقل مند سمجھتا ہے، ان کو بے وقوف خیال کرتا ہے، ان کی گستاخی کرتا ہے، یاد رکھو! یہ طریقہ وطرزِ عمل قرآن وحدیث کے بھی خلاف ہے اور عقل واخلاق کے بھی خلاف ہے۔

حدیث میں والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم

علما نے لکھا ہے کہ والدین کے حقوق کا خلاصہ چار چیزیں ہیں: عظمت، محبت، خدمت اور اطاعت۔

ان کی عظمت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ماں کے قدموں تلے جنت ہے اور باپ جنت کا دروازہ ہے"۔

(نسائي: ۲/۵۳، مشکوٰۃ: ۴۲۰)

والدین سے محبت کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ "جو شخص اپنے والدین کو نظرِ رحمت سے دیکھے گا اس کو ہر ایک نظر پر ایک حجِ مبرور کا ثواب دیا جائے گا"۔

(مشکوٰۃ: ۴۲۱)

ان کی خدمت کے بارے میں فرمایا گیا کہ ایک صحابی اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ میں جہاد کا ارادہ کر رہا ہوں، آپ نے فرمایا کہ کیا تیرے والدین زندہ ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا کہ " فَفِيهِمَا فَجَاهِدْ" کہ تو ان کی خدمت کر کے جہاد کا ثواب حاصل کر۔ (الأدب المفرد: ۱۱)

اور ان کی اطاعت کے بارے میں فرمایا گیا کہ "ان کی نافرمانی کبیرہ گناہوں میں سے ہے"۔ (البخاري: ۲/۸۸۴)

حدیث میں آتا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر والدین کو کوئی غصہ دلاتا ہے، تو اللہ اس سے غصہ وغضب میں آتا ہے، لوگوں نے پوچھا کہ والدین نے اگر ظلم کیا ہو تب؟ فرمایا کہ اگرچہ والدین نے ظلم ہی کیوں نہ کیا ہو، تب بھی ان کو غصہ دلانا خدا کے غضب کا باعث ہے۔ (الأدب المفرد: ۱۱)

غرض یہ کہ حسنِ معاشرت کو قائم رکھنے اور کامل انسان بننے کے لیے ایک طرف والدین کے حقوق جو ہمارے ذمہ ہیں، ان کو ادا کرنا ضروری ہے۔ دوسرے اگر ہمارے حقوق میں ان سے کوتاہی ہو جائے، تو درگذر سے کام لینا چاہیے، اس کا اثر یہ ہوگا کہ دین وآخرت کے ساتھ انسان کی دنیا بھی بن جاتی ہے اور دنیا ہی میں اس کو جنت کا مزہ آنے لگتا ہے۔

بچوں کے حقوق والدین پر

ہماری شریعت میں جس طرح والدین کے حقوق بتائے، اسی طرح بچوں کے جو حقوق والدین پر عائد ہوتے ہیں وہ بھی بتائے گئے ہیں کہ ان کا اچھا نام رکھا جائے ان کی اچھی تربیت کی جائے، ان کی اچھی تعلیم کا نظم کیا جائے اور ان کی

شادی کی جائے۔

ایک حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''إِنَّ مِنْ حَقِّ الْوَلَدِ عَلَى الْوَالِدِ أَنْ يُحْسِنَ اسْمَهُ وَ يُحْسِنَ أَدَبَهُ'' (بلاشبہ باپ کے ذمہ اپنی اولاد کا حق یہ ہے کہ اس کا اچھا نام رکھے اور عمدہ تعلیم وتربیت دے)

(مسند بزار: ۸۵۴۰)

ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: کسی باپ نے اپنے بچے کو عمدہ ادب واخلاق سے بڑھیا کوئی تحفہ نہیں دیا۔

(ترمذي: ۱۹۵۲، أحمد: ۱۵۴۳۹، سنن بيهقي: ۵۳۰۰، شعب الإيمان: ۱۱/۱۳۰)

اللہ نے ماں باپ کو ان ذمہ داریوں کا مکلّف کیا ہے۔ دنیوی ذمہ داریاں بھی ہیں اور ماں باپ پر دینی ذمہ داریاں بھی ہیں کہ بچوں کے اخلاق کو سنواریں، ان کے ایمان کو مضبوط بنانے کی فکر کریں، ان کے اندر توکل علی اللہ پیدا کریں، نیک صفات پیدا کریں، ان کے اندر خوف وخشیت پیدا کریں، تعلق مع اللہ پیدا کریں، ماں باپ کا حق بھی بتائیں، بڑوں اور چھوٹوں کے آداب بھی سکھائیں۔

اگر ماں باپ نے اس طرح بچوں کی تربیت نہیں کی، تو وہ بچوں کے حقوق میں کوتاہی کے خطا کار ہیں اور ایسے بچے بڑے ہو کر خود ماں باپ کی قدر نہ کریں، غلط راہوں پر پڑ جائیں، تو اس کے ذمہ دار بھی والدین ہی ہوں گے۔

اسلام میں میاں بیوی کی معاشرت

اب لیجیے! ازدواجی زندگی کو؛ میاں بیوی کا تعلقِ زوجیت ایک اہم اور قابل قدر تعلق ہے؛ اس لیے اسلام نے اس تعلق کو ہر ممکنہ تدبیر سے قائم وباقی رکھنے کی تعلیم

دی ہے اور اس تعلق کو خوش گوار و پر لطف بنانے کی تعلیم دی ہے؛ بل کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں اس تعلق کو مودت و محبت اور رحمت کا تعلق قرار دیا ہے۔

اس تعلق کو خوش گوار بنانے کے لیے ایک طرف بیوی کو یہ تعلیم دی گئی کہ وہ اپنے شوہر کو اپنا سردار و حاکم خیال کرے، اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ﴾ [النساء: ۳۴]

(مرد عورتوں کے نگران ہیں)

نیز ان کی عزت اور مرتبے کا پاس رکھے۔ حدیث میں فرمایا کہ میں اللہ کے علاوہ کسی اور کو سجدے کا حکم دیتا، تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے مرد کو سجدہ کرے۔

(ابو داؤد: ۲۹۱)

نیز اس کو تعلیم دی گئی کہ مرد کے ساتھ اس طرح پیش آئے کہ اس کا دل خوش ہو جائے۔ حدیث میں فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ سب سے بہتر عورت کون ہے؟ فرمایا کہ ''وہ عورت جو اپنے شوہر کو خوش کر دے، جب وہ اس کو دیکھے، اور اس کی اطاعت کرے، جب وہ حکم دے اور اس کی مرضی کے خلاف اپنے مال و نفس کو استعمال کر کے اس کی مخالفت نہ کرے۔'' (نسائي: ۲/۷۱)

دوسری طرف مردوں کو تعلیم دی گئی کہ ''عورتوں کے ساتھ بھلائی و خیریت کے ساتھ پیش آؤ۔'' اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مجھ سے عورتوں کے بارے میں خیر کی وصیت قبول کرو۔

(بخاری: ۲/۷۷۹، مسلم: ۱/۴۷۵)

اور فرمایا کہ ''عورت میں کچھ کمی و عیب ہو، تو در گذر کرتے ہوئے اس کے ساتھ زندگی گزارو، اگر تم اس کو بالکل سیدھا کرنے جاؤ گے، تو پسلی کی طرح وہ ٹوٹ جائے گی۔'' (مسلم: ۱/۴۷۵)

نیز مردوں کو حکم دیا گیا کہ ''عورتوں کی کوئی عادت ناپسند بھی ہے، تو ان سے بغض نہ رکھو'' (مسلم: ۱/۴۵۷)

پھر مردوں کو بتایا کہ ''عورت دنیا میں سب سے بہترین چیز ہے''۔

(نسائی: ۲/۷۱)

اللہ کے رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا ''مجھے تین چیزوں سے محبت ہے؛ ایک عطر، دوسرے عورت، تیسرے نماز۔''

(مشکوٰۃ: ۲۶۷)

نیز عورتوں کے نان ونفقے کے حقوق مرد کے ذمہ رکھے گئے اور بتایا گیا:

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ [البقرۃ: ۲۲۸]

(جتنے حقوق مردوں کے عورتوں پر ہیں، اتنے ہی عورتوں کے حقوق مردوں پر بھی ہیں)

تو اسلام نے میاں بیوی دونوں کے حقوق بتائے ہیں اور ایک کو دوسرے کے سامنے باعزت طریقے پر پیش کیا ہے اور ایک دوسرے کو سمجھ کر حسنِ معاشرت کے ساتھ زندگی گزارنے کی تعلیم دی ہے۔

رسول اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی معاشرت

خود اللہ کے رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ہمارے لیے بہترین نمونہ چھوڑا ہے حدیث کی کتابوں میں اس سلسلے میں بہت سارے واقعات موجود ہیں، مگر سب کا احاطہ، نہ ممکن ہے اور نہ ضروری؛ لہٰذا چند واقعات پیش کرتا ہوں۔

رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ گھر میں ازواجِ مطہرات کے ساتھ نہایت بے

تکلفی اور دل بستگی سے رہتے تھے۔ اپنے گھر میں اپنا کام خود کر لیتے تھے اور اس طرح رہتے تھے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جیسے عام آدمی رہتے ہیں۔

(شمائلِ ترمذی: ۲۳)

نیز ازواجِ مطہرات کے ساتھ مزاح بھی فرماتے تھے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ایک سفر کے موقع پر دوڑ لگائی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کم سن اور خفیف بدن کی تھیں؛ لہٰذا وہ آگے بڑھ گئیں، پھر کسی موقع پر اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ دوڑ لگائی، مگر اب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بدن بھاری ہو گیا تھا، لہٰذا اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان پر سبقت لے گئے اور فرمایا کہ یہ پہلی دفعہ کا بدلا ہے۔

(أبو داؤد: ۲۵۸۰، سنن بیهقي: ۲۰۲۵۳، حمیدي: ۱/۱۲۸)

یہ ہے حسنِ معاشرت کہ اتنے بڑے رسول ہو کر آپ ازواجِ مطہرات کی اتنی رعایت فرما رہے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا چوں کہ چھ برس میں آپ سے بیاہی گئیں اور نو سال کی عمر میں آپ کی رخصتی ہوئی تھی، تو طبیعت میں ابھی بچپن تھا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کی رعایت کرتے اور ان کو کھلونوں سے اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلنے کا موقع دیتے تھے۔ (بخاري: ۱/۹۰۵، مشکوٰۃ: ۱۲۸)

ایک مرتبہ آپ کی ازواج نے آپ سے نفقے کا مطالبہ کیا اور آپ کے پاس جمع ہو گئیں اور زور زور سے آپ سے باتیں کرنے لگیں۔ اتنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے اور اندر آنے کی اجازت چاہی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آواز سننا تھا کہ سب اٹھ کر پردے میں ہو گئیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اندر آئے، جب کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عورتوں کی اس حرکت پر ہنس رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ کو

اللہ ہنستا رکھے، کیا بات ہے؟ فرمایا کہ مجھے ان عورتوں پر تعجب ہوا کہ یہ میرے پاس تھیں ، جب تمہاری آواز معلوم ہوئی،تو سب پردے میں چلی گئیں۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یارسول اللہ! آپ زیادہ حق دار تھے کہ یہ آپ سے خوف کھاتیں، پھر آپ رضی اللہ عنہ ازواج کی طرف متوجہ ہوکر کہنے لگے کہ تم اے اپنے نفس کی دشمنو! مجھ سے تو ڈرتی ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ڈرتیں؟ ازواج نے فرمایا کہ اے عمر! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں آپ بہت سخت ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عمر! ان کو چھوڑ دو۔ پھر فرمایا کہ تم سے شیطان بھی ڈرتا ہے اور تم جس راستے پر جاتے ہو، شیطان وہاں سے دوسرے راستے کو چلا جاتا ہے۔ (بخاري: ۲/۸۹۹)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت اپنی ازواج کے ساتھ کیسی تھی؟ آپ ان کی کس قدر رعایت فرماتے تھے آپ نے خود ہی فرمایا کہ ''میں تم میں اپنی ازواج کے ساتھ سب سے زیادہ با اخلاق ہوں''۔

کبھی آپ ازواجِ مطہرات سے کہانیاں بھی سنتے ان کی باتیں سن کر ہنستے۔

(شمائل: ۱۷، بخاری: ۲/۷۷۹)

ایک عجیب واقعہ حدیث کی کتابوں میں آیا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حریرہ بنا کر لائیں۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا بھی حاضر تھیں ،حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ تم بھی کھاؤ، مگر انہوں نے انکار کردیا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اگر تم نہیں کھاتیں، تو میں یہ حریرہ تمہارے منہ پر مل دوں گی۔ پھر بھی حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے انکار کیا، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حریرہ میں ہاتھ ڈال کر ان کے چہرہ پر اس کو مل دیا اور یہ دیکھ کر اللہ کے

رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہنسے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہاتھ پکڑلیا۔ اور حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اب تم ان کے چہرے پر مل دو اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم برابر ہنستے رہے۔ (حياة الصحابة: ٢/٩٩٧)

یہ ہے ہمارے نبی کا اسوہ، ہر چیز میں آپ ہمارے لیے نمونہ اور اسوۂ حسنہ ہیں، تو بیوی کے ساتھ حسنِ سلوک میں بھی ہمیں چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اسوے کو اپنا کر اپنی زندگیوں میں سکون پیدا کریں اور اللہ کو راضی کریں۔

بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت

اسلام نے حسنِ معاشرت کی جو تعلیم دی ہے، اس میں ایک بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت بھی ہے۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی تعظیم وتوقیر نہ کرے، وہ ہم میں سے نہیں۔

(الأدب المفرد: ٧٥)

اس میں حسنِ معاشرت کے قیام کا بڑا اہم اصول بیان فرمایا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ بڑوں کو چاہیے کہ چھوٹوں سے رحمت ومحبت وشفقت کا معاملہ کریں اور چھوٹوں کو چاہیے کہ وہ بڑوں سے عظمت وتوقیر کا برتاؤ کریں۔ بڑوں میں والدین اور ان کے ہم رتبہ رشتہ دار جیسے: دادا، دادی، نانا، نانی، تایا، چچا، ماموں، پھوپھی، خالہ وغیرہ سب آجاتے ہیں۔ اسی طرح غیروں میں سے جو عمر میں، تجربہ میں، علم میں، بزرگی وتقوے میں بڑے ہوں، وہ بھی اس میں داخل ہیں۔ جیسے: استاذ، پیر، عالم، بوڑھے لوگ وغیرہ۔ اس طرح چھوٹوں سے جہاں اپنی اولاد مراد ہوگی، وہیں اولاد کی حیثیت رکھنے والے رشتہ دار بھی مراد ہوں گے۔ جیسے بھائی و بہن کی اولاد وغیرہ۔

نیز شاگرد، مرید اور عمر میں چھوٹے سب ہی لوگ مراد ہوں گے۔ غور کیجیے! اگر ان بڑوں کی طرف سے چھوٹوں پر شفقت و رحمت کا معاملہ ہوگا اور چھوٹوں کی جانب سے بڑوں کے ساتھ عظمت و اجلال کا برتاؤ ہوگا، تو معاشرت میں کیسا حسن پیدا ہوگا؟۔

سیرتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے سبق

اب ذرا سیرت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں حسنِ معاشرت کا باب کھول کر دیکھیے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑوں اور چھوٹوں کے ساتھ کس طرح معاملہ فرمایا ہے؟۔

حضرت ابو طفیل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے مقامِ جوانہ میں رسول اللہ کو گوشت تقسیم کرتے ہوئے دیکھا، ناگہاں (اچانک) ایک عورت آئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوگئی، آپ نے اپنی چادر اس کے لیے بچھائی اور وہ اس پر بیٹھ گئی، حضرت ابو طفیل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون عورت ہے، لوگوں نے بتایا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ ماں ہیں، جنھوں نے آپ کو دودھ پلایا تھا۔ (مشکوٰۃ: ۴۲۰)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے والد حضرت ابو قحافہ رضی اللہ عنہ فتحِ مکہ کے موقع پر ایمان لائے تھے، اور کافی بڑی عمر کے آدمی تھے، ان کے ایمان لانے کا واقعہ کتبِ سیرت میں تفصیل سے آیا ہے، اس میں ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے والد کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور بتایا کہ یہ میرے والد ہیں اور ایمان قبول کرنے کے لیے آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر فرمایا کہ ابو بکر! آپ

نے ان کو کیوں تکلیف دی، میں خود ان کے پاس چلا جاتا۔

(سیرة ابن هشام: ۲/۶۰۴)

ان واقعات سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑوں کی تعظیم وتوقیر کرنا معلوم ہوا، اسی کے ساتھ احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ دوسروں کو بھی برابر اس کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

چناں چہ حدیث میں ہے کہ ایک موقعے پر حضرت محیصہ بن مسعود، حضرت حویصہ بن مسعود اور حضرت عبدالرحمان بن سہل رضی اللہ عنہم تینوں صحابہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوے۔ ان میں عبدالرحمٰن بن سہل رضی اللہ عنہ کی عمر باقی دو صحابہ کے مقابلے میں کم تھی ،مگر اللہ کے صلی اللہ علیہ وسلم سے انھوں نے گفتگو شروع کی، تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا "کَبِّرْ کَبِّرْ" یعنی بڑوں کو بات کرنے دو، بڑوں کو بات کرنے دو، یہ سن کر حضرت عبدالرحمان خاموش ہوگئے۔ (رياض الصالحين: ۱۴۲، الأدب المفرد: ۷۵)

اسی طرح علما وعقلا کی تعظیم کا سبق بھی آپ نے دیا ہے۔ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ (نماز میں) مجھ سے وہ لوگ قریب رہیں، جو علم وعقل والے ہیں۔ (مسلم: ۱/۱۸۱)

غرض یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم قولاً وعملاً دی ہے کہ بڑوں کی عظمت وتوقیر کی جائے اور ان کے اکرام واجلال کو مدِ نظر رکھا جائے، یہ بڑوں کے حقوق ہیں۔

بچوں پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت

یہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے بڑوں کے ادب وتعظیم کی تعلیم تھی

اور دوسری طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچوں اور چھوٹوں سے شفقت ورحمت کا معاملہ و برتاؤ کر کے اس کی تعلیم بھی دی ہے۔

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک صحابی حضرت اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ آئے، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کو جو بچے تھے پیار کیا۔ حضرت اقرع رضی اللہ عنہ نے تعجب سے کہا کہ کیا آپ بچوں کا بوسہ لیتے ہیں؟ میرے دس لڑکے ہیں، لیکن میں نے آج تک کسی کا بوسہ نہیں لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ ان ہی صحابی سے آپ نے فرمایا کہ میں کیا کرسکتا ہوں؟ اگر اللہ تعالی نے تمہارے دل سے رحمت وشفقت کو نکال لیا ہے۔

(بخاري : ۲/۸۸۷، مسلم: ۲/۲۵۴)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کسی کو بچوں پر شفقت کرنے والا نہیں دیکھا۔

(مسلم: ۲/۲۵۴)

آپ کا بچوں پر شفقت کا یہ حال تھا کہ آپ فرماتے ہیں کہ میں نماز شروع کرتا ہوں اور ارادہ کرتا ہوں کہ لمبی نماز پڑھوں، مگر جب کسی بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں، تو نماز کو مختصر کر دیتا ہوں، اس خیال سے کہ اس کی ماں کہیں پریشان نہ ہو جائے اور وہ غم میں نہ پڑ جائے۔ (بخاري : ۱/۹۸)

بچوں سے آپ کے پیار کے عجیب واقعات کتابوں میں آئے ہیں۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ آپ ممبر پر خطبۂ جمعہ ارشاد فرما رہے تھے، اسی دوران آپ کے نواسے حضرت حسن وحضرت حسین رضی اللہ عنہما لال قمیصوں میں ملبوس مسجد میں آئے، ان کو دیکھ کر

آپ نے خطبہ قطع فرمادیا اور ممبر سے اتر کر ان دونوں کو اٹھالیا اور ممبر پر تشریف لائے اور فرمایا کہ اللہ نے سچ کہا ہے کہ تمہارے اموال واولاد فتنہ ہیں۔ میں نے ان دونوں کو قمیصوں میں دیکھا، تو صبر نہ آیا، لہٰذا میں نے ان کو اٹھالیا۔

(مسند أحمد: ۳۵۴/۵، ترمذي: ۲۲۸/۲)

کبھی آپ بچوں کو اپنے کندھوں پر اٹھالیتے تھے اور کبھی اسی حالت میں نماز بھی پڑھتے تھے۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ ہماری طرف تشریف لائے اور آپ کے کندھے پر آپ کی نواسی ''امامہ'' بیٹھی ہوئی تھیں، آپ نے اسی حالت میں نماز ادا فرمائی جب رکوع یا سجدہ کرنا چاہتے تھے، تو بچی کو اتار دیتے اور جب کھڑے ہوتے، تو پھر اٹھالیتے اور بعض روایات میں ہے کہ اسی حالت میں آپ نے امامت فرمائی تھی۔ (بخاري: ۸۸۷/۲، مسلم: ۲۰۵/۱)

کبھی آپ بچوں سے مزاح وتفریح بھی فرمایا کرتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان کو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر پکارا، اے دو کان والے! اس حدیث کے راوی اسامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آپ نے ان سے مزاح فرمایا تھا۔ (شمائلِ ترمذی: ۱۵)

یہ چند مثالیں ہیں، جن سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بچوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرنا ثابت ہوتا ہے۔ یہ ہیں بڑوں اور چھوٹوں کے ساتھ برتاؤ کے آداب وحقوق جن سے حسنِ معاشرت قائم ہوتی ہے۔

پڑوسیوں سے حسن معاشرت

حسن معاشرت کی تعلیم کا ایک اہم جزوحصہ وہ ہے، جو پڑوسیوں کے ساتھ

سلوک و برتاؤ کے متعلق ہے؛ کیوں کہ پڑوس سے رابطہ وتعلق ہر آن ولمحہ برقرار رہتا ہے۔اٹھتے بیٹھتے ان سے سابقہ پڑتا ہے۔لہٰذا معاشرت میں لطف وحسن پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پڑوسیوں کے ساتھ تعلقات کو بہتر سے بہتر بنایا جائے۔

چناں چہ قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم دی گئی ہے۔

ان مقامات پر حکم دیا گیا ہے کہ پڑوسیوں کے ساتھ احسان کرواور لفظِ احسان میں ہر بھلائی وخوبی نظر آجاتی ہے اوراحادیث میں تو اس سلسلے میں نہایت سخت تاکیدی احکامات آئے ہیں۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: ”ما زال جبريل يوصيني بالجار حتیٰ ظننت أنه سيورثه “(حضرت جبرئیل عَلَیْہِ السَّلَام مجھے پڑوسیوں کے بارے میں برابر وصیت ونصیحت فرماتے رہے؛ حتی کہ میں نے یہ خیال کیا کہ شاید پڑوسی کو پڑوسی کا وارث قرار دیا جائے گا)

(بخاري: ٦٠١٥،مسلم: ٢٨٥٤،ترمذي: ١٩٤٢،ابو داؤد: ٥١٥٤،ابن ماجه: ٣٦٧٣، الأدب المفرد: ١٠٥)

اللہ اکبر! عجیب حدیث ہے کہ اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرماتے ہیں کہ حضرت جبرئیل عَلَیْہِ السَّلَام مسلسل پڑوسی کے بارے میں مجھے اچھے سلوک کی اور اس کے حقوق کے ادا کرنے کی وصیت کرتے رہے، یہاں تک کہ مجھے یہ اندیشہ وخیال ہونے لگا کہ شاید حضرت جبرئیل عَلَیْہِ السَّلَام عن قریب یہ حکم بھی لائیں گے کہ باپ کے انتقال کے بعد جس طرح بچوں کو جائیداد میں حصہ ملتا ہے، اسی طرح پڑوسی کو بھی مال میں حصہ دینا پڑے گا۔

سوچیئے! اگر ایسا حکم آجاتا، تو کون پڑوسی کو دیتا؟ جب کہ آج بھائی بھائی کو دینے

تیار نہیں ، بہن بہن کو دینے تیار نہیں، بڑے چھوٹوں کا حق دینے تیار نہیں، ایسے زمانے میں پڑوسی کو مال میں حصہ کون دیتا ؟ اگر چہ یہ حکم آیا نہیں ، نازل نہیں ہوا؛ مگراس حدیث سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کتنا بڑا حق ہے پڑوسی کا؟

ایک اورحدیث میں فرمایا:’’من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليُحْسِنُ إلىٰ جاره ‘‘(جوشخص اللہ پراور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے،اس کو چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرے)

(سنن دارمي: ٢٠٣٦)

ایک حدیث میں یہ فرمایا: من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليُكْرِمْ جارَه‘‘(جواللہ پراور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے،وہ اپنے پڑوسی کا اکرام کرے) (بخاري: ٦٠١٩، مسلم: ١٨٢)

اوردوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:’’من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يُؤْذِ جارَه‘‘(جواللہ پراور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کوتکلیف نہ پہنچائے) (بخاري : ٦١٣٦،مسلم: ١٨٣)

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ خدا کی قسم وہ مومن نہیں! خدا کی قسم وہ مومن نہیں! آپ سے پوچھا گیا کہ کون یارسول اللہ؟ فرمایا کہ وہ جس کی ایذاؤں اور تکلیفوں سے اس کا پڑوسی محفوظ نہیں ہے۔

(بخاری : ٦٠١٦مسند احمد: ٧٨٦٥،مسند بزار: ٨٥١٣)

بھائیو! آج ہمارے معاشرے پر ایک نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ آج پڑوسی کو ہماری طرف سے کتنی تکلیف ہورہی ہے؟ آج لوگ جان بوجھ کر پڑوسی کوستانا اور ایذا دینا چاہتے ہیں،اپنے گھروں کی ساری گندگی پڑوسی کے گھر کے سامنے لے جا کر ڈال دیتے ہیں،اپنے گھروں میں اتنا شوروہنگامہ کرتے ہیں کہ پڑوسی کی نیندحرام

ہوجاتی ہے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑنے، مارنے، مرنے تیار ہوجاتے ہیں۔ کیا ایک ایمان والا ایسی حرکت کرسکتا ہے؟ وہ مومن تو کیا؟ ایک اچھا انسان بھی کہلانے کا مستحق نہیں ہوسکتا۔

پڑوسی کی خبر گیری ومدد کا حکم

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسی کی خبر گیری کرنے اوراس کا تعاون کرنے کا حکم بھی دیا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لیس المؤمنُ الَّذِيْ یَشْبَعُ وَجَارُہُ جَائِعٌ'' (وہ مومن (کامل) نہیں ہوسکتا، جوخود پیٹ بھر کر کھائے اوراس کا پڑوسی بھوکا ہو)

(الأدب المفرد: ١١٢)

مطلب یہ ہے کہ پڑوسی کی خبر گیری کرنا چاہیےاوراگر وہ بھوکا ہو، تواپنے کھانے میں سے اس کو بھی دینا چاہیے، اگر کوئی ایسا نہیں کرتا اور خود سیراب ہوتا ہے، تو فرمایا کہ وہ کامل ایمان والا نہیں ہوسکتا۔

اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو تعلیم دی ہے کہ اپنے سالن میں ذرا پانی زیادہ کرواوراپنے پڑوسیوں کو اس میں سے حصہ دو۔

(مسلم: ٦٨٥٥، ابن ماجه: ٣٣٦٢، الأدب المفرد: ١١٣، أحمد: ٢١٤٦٥)

حضرت نافع رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم پرایک ایسا زمانہ گذرا ہے کہ اس میں درہم ودینار کا اپنے مسلمان بھائی سے زیادہ کوئی مستحق وحق دار نہیں سمجھا جاتا تھا۔ پھراب یہ حال ہے کہ ہم کو درہم ودینار اپنے مسلمان بھائی سے زیادہ محبوب ہوگئے ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بہت سے پڑوسی قیامت کے دن لوگوں کے دامن پکڑے ہوئے اللہ سے شکایت کریں گے کہ اے اللہ! یہ وہ ہے، جس نے اپنا دروازہ مجھ پر بند کردیا تھا اور بھلائی سے مجھ کو روک دیا تھا۔

(الأدب المفرد: ١١١، تهذيب الآثار طبري: ١٤٩)

ان تمام احادیث سے واضح ہوا کہ پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ معاشرت کا تاکیدی حکم شریعت نے دیا ہے کہ ان سے سلوک اچھا ہو، ایذا و تکلیف نہ پہنچائی جائے، ان کی خبر گیری کی جائے، اپنے کھانے میں سے ان کا بھی حصہ نکالا جائے، ضرورت پر اپنا دروازہ ان کے لیے بند نہ کرے۔

عارضی پڑوسی کی بھی رعایت کریں

ایک اہم بات پڑوس کے سلسلے میں یہ یاد رکھیں کہ پڑوسی صرف وہ نہیں، جو ہمارے گھر کے قریب رہتا ہے؛ بل کہ پڑوسی وہ بھی ہے، جو کچھ گھنٹوں کے لیے، کچھ دیر کے لیے آپ کے ساتھ ہو جاتا ہے، بس میں، ٹرین میں، ہوائی جہاز میں یا کسی مجلس میں، مسجد میں ۔جب یہ بھی پڑوسی ہے، تو اس کے حقوق بھی ادا کرنا ضروری ہے۔

قرآنِ کریم میں ایسے پڑوسی کو ''اَلْجَارُ الْجُنُبُ'' کہا گیا ہے اور اس کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے۔

مثلاً: مسجد میں آپ نماز کے لیے گئے، وہاں کچھ دیر کے لیے رہنا ہے، تو جو بھی مسلمان مسجد میں ہوگا، وہ آپ کا پڑوسی ہوگا، اس کی رعایت کرنا آپ پر ضروری ہے، اسے آپ کی طرف سے کوئی تکلیف نہ ہو؛ لیکن آج لوگ مساجد میں لوگوں کو تکلیف دیتے ہیں، کچھ لوگ مسجد میں داخل ہوتے ہیں اور نماز پڑھنے کے لیے بالکل

دروازے پر کھڑے ہوجاتے ہیں اور اتنے خشوع وخضوع کے ساتھ نماز میں مشغول ہوجاتے ہیں کہ انہیں احساس تک نہیں ہوتا کہ میری وجہ سے لوگوں کو مسجد آنے میں تکلیف ہورہی ہے۔

اللہ نے ایسا حکم نہیں دیا کہ دوسروں کو تکلیف دیتے ہوئے نماز پڑھو؛ بل کہ حکم یہ ہے کہ نماز ایسی جگہ پڑھو، جہاں سے گزرنے میں کسی کو تکلیف نہ ہو۔

اسی طرح بعض لوگ کسی نماز پڑھنے والے کے بالکل پیچھے کھڑے ہوکر نماز پڑھنا شروع کردیتے ہیں۔ یہ بھی غلط اور قابلِ اصلاح بات ہے۔ ذرا سوچیے کہ اگر سامنے نماز پڑھنے والا پہلے فارغ ہوجائے اور اسے کسی ضرورت سے فوراً جانا ہو، تو وہ کیسے جائے گا؟ اگر جائے گا، تو گنہ گار ہوگا، نہیں جائے گا تو پریشان ہوگا، جب تک وہ پریشان رہے گا، پیچھے نماز پڑھنے والے کو نماز میں ہوتے ہوئے بھی گناہ ہوگا؛ لیکن لوگ آج اتنے بے حس ہوگئے ہیں کہ ان ساری چیزوں کا احساس ہونا تو دور کی بات، بتانے کے باوجود عمل نہیں کرتے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ اور پڑوسی کی رعایت

ایک مرتبہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کو سفر درپیش ہوا، ساتھ میں اور بھی کچھ لوگ تھے، درمیان میں کہیں ایک جگہ نماز پڑھنے کے لیے رکے اور نماز پڑھی، سب لوگ نماز سے فارغ ہوگئے، حضرت تھانوی رحمہ اللہ بھی فارغ ہوگئے؛ مگر ایک دو ساتھی بڑے خشوع سے نماز کی سنتوں میں مشغول ہوگئے، لمبا رکوع، لمبا سجدہ، لمبا قیام ہورہا تھا، دیگر ساتھیوں کو پریشانی ہورہی تھی؛ اس لیے کہ سفر میں تاخیر کرنے سے کبھی ٹرین چھوٹ سکتی ہے، کبھی بس چھوٹ سکتی ہے، کبھی فلائٹ چھوٹ سکتی ہے۔

اور سفر میں شریعت نے نماز میں تخفیف کردی ہے کہ آدمی تنہا ہو یا سارے ہی

مسافرین ہوں، تو چار رکعت والی نماز دو کر دی ہے اور دوسری تخفیف یہ کر دی ہے کہ سنتِ مؤکدہ کو بھی معاف کر دیا ہے، پڑھنا چاہو، تو پڑھ سکتے ہیں، نہ پڑھنا چاہو، تو چھوڑ سکتے ہیں۔ یہ ہے شریعت کا حکم۔

جب یہ دو ساتھی نماز سے فارغ ہو کر آئے، تو حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے فرمایا کہ بھائی! سنت اس طرح پڑھنے کی گنجائش ہوتی، تو شریعت فرائض میں بھی دو کے بجائے چار کا ہی حکم دیتی، اتنی لمبی سنتیں پڑھنے سے فرائض کو دو کرنے کا مقصد ہی ختم ہو گیا، تم نے اس کی رعایت نہیں کی۔ پھر فرمایا کہ میرا معمول سفر میں یہ ہے کہ میں سفر میں سنتوں و نوافل کو اس خوف سے چھوڑ دیتا ہوں کہ کہیں ساتھیوں کو تکلیف نہ ہو جائے۔

اسی طرح بس میں، ٹرین میں، ہوائی جہاز میں جو لوگ ہمارے ساتھ ہوتے ہیں، وہ بھی ہمارے پڑوسی ہیں، ان کی رعایت کرنا، ان کے ساتھ نیکی کا معاملہ کرنا اور ان کا تعاون کرنا بھی ضروری ہے اور اس سے بڑھ کر یہ ضروری ہے کہ ہم ان کو کوئی تکلیف نہ پہنچائیں۔

بہر حال! وقتی و عارضی پڑوسی کا بھی خیال رکھنا بہت ضروری ہے؛ اسی پڑوسی کی رعایت کے لیے شریعت نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ اپنی مجلسوں میں وسعت پیدا کرو اور آنے والوں کے لیے جگہ دو، یہ بھی پڑوسی کے حقوق میں سے ہے۔

پڑوسی کی ایذا پر صبر اور ایک عجیب واقعہ

یہ تصویر کا ایک رخ ہے، دوسرا رخ یہ ہے کہ اگر ہمارے کسی پڑوسی سے ہم کو تکلیف ہو، تو صبر سے کام لیں۔ اس پر ایک واقعہ عرض کرتا ہوں جس کو علامہ ذہبی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اپنی کتاب "الکبائر" میں درج کیا ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت

سہل بن عبداللہ تستری رحمہ اللہ کا ایک غیر مسلم پڑوسی تھا اور اس کے گھر کے بیت الخلا سے ایک سوراخ ہو کر حضرت تستری رحمہ اللہ کے گھر میں نجاست آ کر گرتی۔ حضرت نے اس جگہ ایک برتن رکھ دیا، دن بھر اس میں نجاست جمع ہوتی اور رات کو آپ لے جا کر کسی دور جگہ ڈال آتے۔ یہ سلسلہ برسہا برس جاری رہا، جب آپ کے انتقال کا وقت قریب آنے لگا، تو آپ نے اس پڑوسی کو بلایا اور فرمایا کہ اس کمرے میں جا کر دیکھو کیا ہے؟ اس نے دیکھا کہ برتن ہے اور اس میں نجاست گر رہی ہے۔ آپ نے اس سے فرمایا کہ ایک طویل عرصے سے تیرے گھر سے اس طرح نجاست گرتی ہے اور میں دن میں جمع کر کے رات کو دور جگہ ڈال آتا تھا۔ مگر اب اس لیے بتانا پڑا کہ میری موت قریب ہے اور شاید اس جگہ آنے والا دوسرا پڑوسی ایسے اخلاق نہ برت سکے؛ لہٰذا اس کا کوئی تدارک کر دو۔ یہ سن کر اس نے کہا کہ اے شیخ! آپ تو ہمارے ساتھ ایسا معاملہ فرمائیں اور میں کفر پر رہوں۔ آپ اپنا ہاتھ دیجیے کہ میں مسلمان ہوتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ مسلمان ہو گیا۔ (الکبائر: ۲۰۹)

دیکھیے! اچھے اخلاق کا فائدہ کہ کافر بھی مسلمان ہو گیا، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے اخلاق ہی کے ذریعے اسلام پھیلایا، آج ہم بھی اپنے پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا شروع کر دیں، تو پوری دنیا میں اسلام پھیل سکتا ہے۔

رشتہ داروں سے حسنِ سلوک

یہ بات ہر اس شخص پر آشکارا ہے، جو اسلامی تعلیمات سے تھوڑی بہت بھی واقفیت رکھتا ہے کہ اسلام ایک طرف اللہ کی عبادت و اطاعت، اس کی طرف رجوع و انابت، اس پر اعتماد و توکل، اور ہر کام میں اخلاص وللّٰہیت کی دعوت دیتا ہے، تو

دوسری طرف مخلوق کی خدمت، اس پر شفقت، اس سے ہمدردی وغم خواری اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک کی بھی تعلیم دیتا ہے، اسی مخلوق کے ساتھ حسنِ سلوک میں اپنے رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک ان سے محبت و پیار، ان کی خدمت بھی داخل ہے اور اسی کو صلہ رحمی کہا جاتا ہے۔

اس موضوع کی آج کل سخت ترین ضرورت ہے؛ کیوں کہ آج لوگوں میں رشتہ داری کا کوئی مقام واہمیت ہی باقی نہیں رہی، معمولی معمولی باتوں پر رشتے توڑ لیتے ہیں، حتیٰ کہ ایک رشتہ دار دوسرے رشتہ دار کا جانی دشمن بن جاتا ہے۔ بعض لوگ ایک دوسرے کے گھر نہیں جاتے، ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے، ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنا نہیں چاہتے، یہ باتیں آج بہت عام ہوگئی ہیں۔ حتیٰ کہ ان چیزوں کو لوگ کوئی گناہ کا کام نہیں سمجھتے؛ بل کہ بعض لوگ فخر سے کہتے ہیں کہ میں نے اس کو یوں کر دیا اور یوں کہہ دیا۔ اسلام میں صلہ رحمی یعنی رشتہ داری کو جوڑے رکھنے کی بڑی اہمیت اور تاکید ہے اور اس میں کوتاہی کرنے پر سخت وعید بھی آئی ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں اپنے ساتھ رشتہ داری کے حقوق کا بھی ذکر کیا ہے۔

چناں چہ فرمایا ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَ لُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ﴾ (اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حقوق مانگتے ہو اور رشتہ داریوں کی حق تلفی سے ڈرو) (سورة النساء: ۱)

اس میں اللہ سے ڈرنے کا حکم دینے کے ساتھ، رشتہ داری سے ڈرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ اس آیت میں رشتہ داری سے ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ سے ڈر کر اس کا حق ادا کرتے ہیں، اسی طرح رشتہ داری کے حقوق بھی ادا کرو اور رشتہ داری کے حقوق کو ادا کرنے کا نام ہی صلہ رحمی ہے، اس لیے حضرت ابن

عباس ﷛، مجاہد، عکرمہ وغیرہ رحمہم اللہ حضرات نے اس کی تفسیر میں یہی فرمایا کہ مراد یہ کہ صلہ رحمی کرو۔ (ابن کثیر: ۱/۴۴۸)

چناں چہ ایک دوسری آیت میں صاف آیا ہے ﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبىٰ حَقَّهُ﴾ (رشتہ دار کو اس کا حق ادا کرو)۔ اس سے اسلام میں صلہ رحمی کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ رشتہ داری، رحمان کی ایک شاخ ہے (اللہ کی رحمت کی ایک شاخ ہے) جو اس کو جوڑے رکھے گا، اللہ تعالیٰ اس کو جوڑیں گے اور جو اس کو توڑے گا اللہ تعالیٰ اس کو توڑیں گے۔ (الادب المفرد: ۱۸۰)

غور فرمایئے! اس حدیث میں رشتہ داری کو جوڑنے کی کتنی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے کہ اللہ اس کو جوڑے گا۔ اور اللہ کے جوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے اپنے تعلق کو قائم فرمائے گا۔ جس کا تعلق اللہ سے ہو جائے، اس کی عظمت کا کیا ٹھکانہ ہے؟ لوگ بڑے لوگوں سے تعلق ہو جائے، تو پھولے نہیں سماتے اور اس کے لیے وہ بڑی محنت بھی کرتے ہیں اور یہاں دیکھیے! کتنی آسانی سے اللہ سے تعلق قائم ہو سکتا ہے مگر پھر بھی ہم غافل ہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک شخص رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! مجھے ایسا عمل بتا دیجیے جو مجھے جنت میں پہنچا دے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کی عبادت کر، اس کے ساتھ شرک نہ کر، نماز قائم کر، زکاۃ ادا کر اور صلہ رحمی کر۔ (بخاري: ۲/۴۴۸)

اس حدیث میں جنت میں لے جانے والے اعمال میں اللہ کے نبی ﷺ نے صلہ رحمی کا بھی ذکر فرمایا ہے، معلوم ہوا کہ رشتہ داری قائم رکھنا

جنت کا عمل ہے۔ حضرات! ذرا سوچیے کہ کیا ہم کو جنت میں نہیں جانا ہے؟! پھر اس عمل سے غفلت کیوں؟!

صلہ رحمی کرنے کا اُخروی فائدہ اس حدیث میں بتایا گیا ہے اور ایک حدیث میں صلہ رحمی کا دنیوی فائدہ بھی بتایا گیا ہے۔ اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرماتے ہیں: جس کو اس بات سے خوشی ہوتی ہے کہ اس کا رزق زیادہ کر دیا جائے اور اس کی عمر لمبی کر دی جائے، تو اس کو چاہیے کہ وہ صلہ رحمی کرے۔

(بخاري: ۲/ ۸۸۵)

اس حدیثِ پاک میں صلہ رحمی کے دو بڑے بڑے فائدے ذکر فرمائے ہیں ایک یہ کہ رزق بڑھتا ہے، دوسرے یہ کہ عمر بڑھتی ہے؛ دنیا میں آدمی یہی دو چیزیں چاہتا ہے کہ عمر لمبی ہو اور اس عمر میں آرام سے گذارا ہو جائے، یہ دونوں باتیں صلہ رحمی سے حاصل ہو جاتی ہیں۔

ایک حدیث پر شبہ کا جواب

اس حدیث پر بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ انسان کی عمر مقرر ہے؛ پھر اس کو بڑھانے کا کیا مطلب ہے؟ مثلاً ساٹھ سال کی عمر والا ستر سال تک زندہ رہے گا، یا کم از کم ایک دو سال کی عمر بڑھ جائے گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض علما کے نزدیک عمر بڑھنے سے مراد یہ ہے کہ عمر میں برکت ہوگی، جس سے بہت سی نیکیاں وہ کر سکے گا۔ تو عمر ساٹھ ہی رہے گی، مگر کام اتنا ہوگا کہ سو سال والے بھی نہ کر سکیں؛ چناں چہ بہت سے بزرگوں کو دیکھا گیا کہ انہوں نے اپنی عمر میں اتنا کام کیا کہ دوسرے لوگ اس سے دس گنا زیادہ عمر بھی پائیں، تو نہ کر سکیں اور بعض علما نے کہا کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو بتاتے ہیں کہ اس کی اتنی عمر ہے۔ پھر جب وہ صلہ رحمی کرتا ہے، تو فرشتوں کو بتاتے

ہیں کہ اس کے عمل کی وجہ سے اتنی عمر زیادہ کردی گئی ہے، تو عمر کی زیادتی فرشتے کے علم کے اعتبار سے ہے۔ (فتح الباري: ۱۰/ ۴۷۶)

الغرض! صلہ رحمی کا فائدہ یہ ہے کہ رزق میں اور عمر میں اضافہ وبرکت کی جاتی ہے۔ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ صلہ رحمی اور عمدہ اخلاق شہروں کی آبادی، عمروں میں زیادتی کا سبب ہیں۔

(فتح الباری: ۱۰/ ۴۱۵)

اس حدیث میں عمر کی زیادتی کے ساتھ صلہ رحمی کا ایک اور فائدہ ذکر کیا گیا ہے، وہ کیا؟ شہروں کی آبادی یعنی جب آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ صلہ رحمی اور حسنِ اخلاق سے پیش آئیں گے، تو محبت والفت پیدا ہوگی، فساد وشر ختم ہوگا۔ آبادی بڑھے گی، ورنہ خود ہی مر کر ختم ہوتے رہیں گے۔

قطع رحمی کا وبال

اب ذرا اس پر بھی نظر ڈالیے کہ صلہ رحمی نہ کرنے اور رشتہ داری کو توڑنے پر کیا وبال آتا ہے؟ ایک حدیث اوپر گذری ہے، جس میں فرمایا کہ رشتہ داری کو جو توڑتا ہے، اس کو اللہ توڑتے ہے یعنی اپنا تعلق توڑ دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ احادیث بھی عبرت ناک ہیں۔

(۱) ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ اس قوم پر اللہ کی رحمت نازل نہیں ہوتی، جس میں رشتہ کو توڑنے والا ہو۔

(الأدب المفرد: ۱۹)

(۲) ایک حدیث میں ہمارے نبی حضرت محمد عربی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ قطع رحمی اور ظلم سے بڑھ کر کوئی گناہ ایسا نہیں کہ آخرت کے عذاب کے ساتھ

اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی اس کے مرتکب کو جلدی عذاب دے دیں۔
(الأدب المفرد: ۲۰، ابو داؤد: ۲/۶۷۲)
یعنی دو گناہ ایسے ہیں کہ دنیا میں بھی ان کو جلدی عذاب میں گرفتار کردیا جاتا ہے اور جو آخرت کے عذاب ہیں وہ الگ۔
(۳) ایک حدیث میں ہے کہ بنی آدم کے اعمال ہر جمعے کی رات اللہ کے سامنے پیش ہوتے ہیں؛ مگر قطع رحمی کرنے والے کے اعمال قبول نہیں کیے جاتے۔
(الأدب المفرد: ۶۲)
(۴) بخاری وغیرہ میں حضرت جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رشتہ توڑنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔
(بخاري: ۲/۸۸۵)
ان احادیث پر غور کیجیے! دنیا و آخرت دونوں جگہ اس پر وبال بتایا گیا ہے جو رشتہ کو توڑتا ہے۔
ایک عجیب واقعہ
ایک مال دار آدمی حج کو گیا اور اپنا مال مکے کے ایک امانت دار شخص کے پاس امانت رکھ دیا اور عرفے کے وقوف و حج سے فراغت کے بعد جب اپنا مال لینے گیا تو پتہ چلا کہ اس شخص کا انتقال ہوگیا ہے اور یہ بھی علم ہوا کہ اس کی امانت کے بارے میں اس کے رشتہ داروں کو کچھ بھی علم نہیں ہے۔ بعض علما نے اس کا مسئلہ سن کر کہا کہ آدھی رات میں زمزم کے کنویں میں اس کو پکارو کہ اے فلانے! اگر وہ جنتی ہے، تو جواب دے گا، وہ گیا پکارا، مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر علما نے اسے دوبارہ مشورہ دیا کہ ”بئرِ برہوت“ (جو یمن کا ایک کنواں ہے) اس میں اس کو پکارو، اگر وہ

دوزخی ہے، تو وہاں سے جواب دے گا۔ اس نے جا کر پکارا، تو جواب ملا اور اس کی امانت کے بارے میں اس نے بتا دیا کہ فلاں جگہ رکھی ہے۔ اس آدمی نے اس سے پوچھا کہ تم دوزخ میں کس طرح چلے گئے، جب کہ ہم تمہارے بارے میں نیک گمان رکھتے تھے؟ اس نے جواب دیا کہ میری ایک بہن تھی جس سے میں نے قطع تعلق کرر کھا تھا، اس کی سزا میں مجھے یہاں دوزخ میں ڈالا گیا ہے۔ علامہ ذہبی رَحِمَهُ اللهُ فرماتے ہیں کہ اس کی تصدیق حدیث میں ہے کہ قطع رحمی کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔

(الکبائر : ۴۹)

یہ واقعہ بتا رہا ہے کہ رشتہ توڑنا دوزخ میں لے جانے والا عمل ہے، اس لیے رشتہ داری کا حق ادا کرنا چاہیے۔

رشتہ داری کا حق کیا ہے؟

اب رہی یہ بات کہ رشتے کو کس طرح جوڑا جائے اور اس کے حق کو کس طرح ادا کرنا چاہیے اور اس کے حقوق کیا ہیں؟ ابنِ حجر رَحِمَهُ اللهُ نے لکھا ہے کہ صلہ رحمی مال سے ہوتی ہے، حاجت وضرورت میں مدد کرنے سے ہوتی ہے، ضرر کو دفع کرنے سے ہوتی ہے، خوشی سے ملاقات کرنے سے ہوتی ہے، دعائے خیر کرنے سے ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر وہ اچھائی، جو ممکن ہو، وہ پہنچانا اور طاقت کے بعد شر سے بچانا، یہ صلہ رحمی کا حاصل ہے۔ (فتح الباري : ۱۰/ ۴۱۸)

سوال یہ ہے کہ رشتہ داروں کے حقوق کیا ہیں؟ میں یہاں چند اہم حقوق کو بیان کرتا ہوں۔

حسنِ سلوک

رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنا اوران کے ساتھ حسنِ اخلاق کا مظاہرہ کرنا ضروری ہے اور یہ ان کا حق ہے، قرآنِ مجید نے صاف طور پر اس کی تعلیم دی ہے، چناں چہ فرمایا: ﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبٰى﴾ (البقرہ:۸۳)
(اور والدین کے ساتھ، رشتہ داروں کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرو)

اس میں جس طرح والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا گیا ہے، اسی طرح اہلِ قرابت کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کی تعلیم دی گئی ہے۔

مالی تعاون

رشتہ داروں کا ایک حق یہ ہے کہ ان کا مالی تعاون بھی کیا جائے، اگر وہ ضرورت مند ومحتاج ہوں۔ قرآن میں متعدد مواقع پر اہلِ قرابت کو اپنے مال میں سے دینے کا حکم دیا گیا ہے، ایک جگہ فرمایا: ﴿قُلْ مَاأَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ﴾ (البقرۃ:۲۱۵)
(آپ کہہ دیجیے کہ جو مال بھی تم خرچ کرو وہ والدین، قریبی رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہونا چاہیے)

معلوم ہوا کہ رشتہ داری کا ایک حق یہ ہے کہ ان کو مال میں سے بھی حسبِ ضرورت ہدیہ کرے یا اپنے رشتہ داروں میں سے کسی کا نفقہ وخرچہ اپنے ذمہ لے لے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک واقعہ

حدیث میں ہے کہ جب قریش قحط سالی میں مبتلا ہوئے اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ سڑی ہوئی ہڈی کھانا پڑا، تو اس وقت اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت

عباس رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی شخص قریش میں خوش حال نہ تھا۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ چچا جان آپ کے بھائی ابوطالب کے یہاں اولاد زیادہ ہے اور قریش کو جو پریشانی ومصیبت آئی ہے، وہ تو آپ کو معلوم ہے، آپ اور میں جا کر ان کے بعض بچوں کو لے آئیں اور ان کی پرورش کریں۔ چناں چہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ دونوں ابوطالب کے پاس گئے اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی پرورش میں لے لیا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو اپنی تربیت میں لے لیا۔ اور ان کی تربیت وپرورش کرتے رہے۔ (حیاۃ الصحابة : ۶۲۲/۲)

حضرات! آج ہم لوگوں کا کیا حال ہے؟ خاندان میں کئی محتاج لوگ اپنی بچیوں اور لڑکیوں کی پرورش وتعلیم کے لیے پریشان ہیں، اگر خاندان کے مال دار لوگ ایک ایک بچے کی ذمہ داری بھی لے لیں، تو کس قدر ان کو سہارا ملے؟ مگر افسوس کہ آج یہ حکم ہم نے بھلا دیا ہے۔

دوہرا اجر ملے گا

غریب رشتہ دار پر خرچ کرنے سے دوہرا اجر ملے گا؛ جیسا کہ بعض احادیث میں وارد ہوا ہے، ایک تو محتاج وضرورت مند کی مدد کرنے کا اجر، دوسرا صلہ رحمی ورشتہ داری کا حق ادا کرنے کا اجر؛ چناں چہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محتاج ومسکین پر صدقہ کرنا ایک صدقہ ہے اور رشتہ دار پر صدقہ کرنا صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی ہے۔ (ریاض الصالحین : ۱۳۴)

غرض! رشتہ داری کی بنیاد پر خرچ کرنا، یہ خود بھی بہت بڑا ثواب کا کام ہے۔

صدقے کا صدقہ اور رشتہ داری کا حق بھی، اس لیے اس پر دوہرا ثواب واجر ہے۔

حاجت وضرورت پر کام آنا

رشتہ داری کا ایک حق یہ ہے کہ رشتہ داروں کی حاجت وضرورت پر ان کے کام آئے، مال کے سوا اور بھی بہت سی ضروریات ہوتی ہیں مثلاً: کسی کام کی سفارش کسی سے کر کے رشتہ دار کا کام بنا دینا، یا کوئی کام رُکا ہوا ہے اور اپنے اندر طاقت وصلاحیت ہے، تو وہ کام کر دینا چاہیے۔ حدیث میں عام لوگوں کے کام کر دینے اور ان کی ضرورت میں کام آنے پر بہت بڑا ثواب بتایا گیا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایسا شخص اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے یا اس کے مانند ہے، جو دن بھر روزہ رکھتا ہے اور رات بھر نماز پڑھتا ہے۔
(بخاري: ۲/۸۸۸)

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی حاجت میں اس کے کام آتا ہے، اللہ اس کی حاجت میں اس کے کام آتا ہے اور جو مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی کوئی پریشانی دور کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ قیامت کی پریشانیوں میں سے اس کی پریشانی دور کرتا ہے۔
(ریاض الصالحین: ۱۰۴)

غور فرمایئے! جب ایک مسلمان بھائی کی ضرورت میں اس کے کام آنے اور اس کی پریشانی کو دور کرنے پر یہ اجر وثواب ہے، تو پھر اپنے رشتہ دار کی ضرورت پر اس کے کام آنے پر کتنا ثواب ملے گا؟ مگر آج کے دور میں رشتہ داری کا یہ حق بھی ختم کر دیا گیا ہے۔ ضرورت پر کام آنے کو لوگ معیوب سمجھنے لگے ہیں، افسوس تو یہ ہے کہ دوسروں کی مصیبت پر غم نہیں ہوتا، رنج نہیں ہوتا۔

دفعِ مضرت

رشتہ داری کا ایک حق یہ ہے کہ اس پر کوئی مصیبت و پریشانی آئی ہے، تو اس کو دفع کرنے میں اس کا تعاون کرے۔ مثلاً: کسی کو بلا وجہ گرفتار کرلیا گیا، تو اس پر یہ ایک مصیبت ہے، اس کو دفع کرنے کی تدبیر کرنا اور کوشش کرنا بھی ضروری ہے اور اس کا ثواب حدیث میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں اس کی پریشانی دور کردے گا، جو کسی کی پریشانی دور کرتا ہے۔ جیسا کہ ابھی وہ حدیث عرض کر چکا ہوں۔

لغزشوں سے درگزر کرنا

ایک حق رشتہ داری کا یہ ہے کہ رشتہ دار سے اگر کوئی لغزش ہوجائے، تو درگذر کردے، معاف کرے۔ علامہ ابن حجر رَحِمَہُ اللّٰہُ نے رشتہ داروں کے حقوق بتاتے ہوئے فرمایا ہے ''والتغافل عن زلاتھم'' ان کی لغزشوں سے چشم پوشی کرنا بھی ان کا حق ہے)۔

مگر یہ صفت بھی آج عنقا (ختم) ہوگئی ہے، ذرا ذرا سی بات پر قطع تعلق کر لیتے ہیں حتی کہ جنازے میں شرکت نہیں کرتے، یہ انتہائی درجے کی قساوتِ قلبی ہے۔

حدیث میں ہے کہ مسلمان بھائی کا ایک حق یہ ہے کہ اس کے عذر کو قبول کرو، اور دوسری حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ کسی مسلمان کو جائز نہیں کہ اپنے مسلمان بھائی سے تین دن تک بات نہ کرے۔ یہ عام مسلمان کے بارے میں آیا ہے، تو رشتہ دار کا کیا حکم ہوگا؟ مگر دیکھیے! کہ آج اس میں کتنی غفلت برتی جارہی ہے؟ اس لیے یاد رکھنا چاہیے کہ لغزش تو ہر ایک سے ہوتی ہے، مگر اس کو مسئلہ نہ بنایا جائے، معاف

کردیں، درگذر سے کام لیں، جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حکم دیا گیا کہ حضرت مسطح رضی اللہ عنہ کی لغزش کو معاف کر کے ان کو نفقہ دو۔

ان حقوق کے علاوہ اور بھی حقوق ہیں مثلاً کبھی کبھی رشتہ داروں کی زیارت کو جانا اور بیمار ہو جائیں، تو عیادت کرنا، کبھی کبھی تحفہ بھیجنا یا لے جانا، ان کے حق میں دعا کرتے رہنا وغیرہ۔

اب سوچیے کہ جب اس طرح رشتہ داروں کے حقوق ادا کرتے ہوئے زندگی بسر کی جائے گی، تو معاشرت میں حسن ولذت کیوں کر نہ پیدا ہوگی؟ ضرور بالضرور اس زندگی میں لذت ولطف، راحت ورحمت کے آثار دکھائی دیں گے اور اس کی وجہ سے ایک انسان مکمل انسان بن جائے گا۔

حق قبول نہ کرنا

مشرکوں اور یہودیوں کی صفت
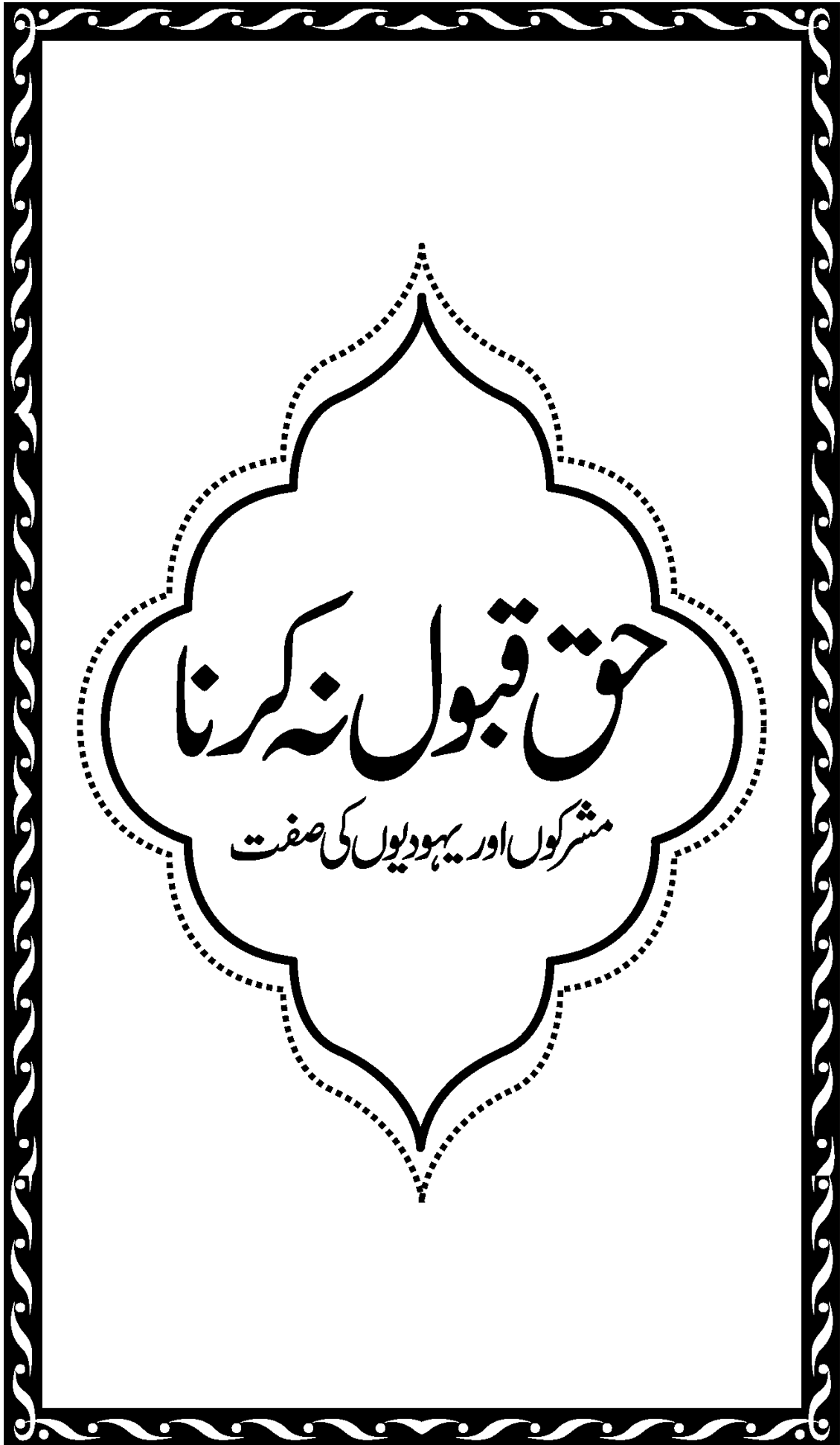
بسم اللہ الرحمن الرحیم

حق قبول نہ کرنا

مشرکوں اور یہودیوں کی صفت

الحمدُ للّٰه رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين ، أما بعد : فقد جاء في بعض الآثار : اَللّٰهُمَّ اَرِنَاالْحَقَّ حَقاً وَارْزُقْنَا اتِّبَاعَهُ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلاً وَارْزُقْنَا اجْتِنَابَهُ.

(تفسیر ابن کثیر: ۱/۱/۵۷)

(بعض آثار میں یہ دعا آئی ہے کہ اے اللہ! ہمیں حق کو حق ہی دکھا اور اس کے اتباع کی توفیق عطا فرما اور باطل کو باطل ہی دکھا اور اس سے بچنے کی توفیق عطا فرما)

یہ ایک جامع ترین دعا ہے، جو حضرت عمر یا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ایک عظیم الشان مضمون ہے، وہ یہ کہ قرآنِ پاک اور احادیث میں مختلف مقامات پر کچھ ایسے لوگوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، جن میں قبولِ حق کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے اور یہ عام طور پر کفار ہوتے ہیں۔ چناں چہ ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَ أَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ [البقرة:٦]

(بلا شبہ وہ لوگ جو کفر کرتے ہیں، اے نبی! آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں سب برابر ہے، وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں)

اسی طرح اور ایک جگہ فرمایا:

﴿ صُمٌّ بُكۡمٌ عُمۡيٌ فَهُمۡ لَا يَرۡجِعُوۡنَ ﴾

(اندھے ہیں، بہرے ہیں، گونگے ہیں) [البقرة:۱۸]

یہاں اندھوں سے مراد ظاہری اندھے نہیں ہیں، گونگے سے مراد ظاہری زبان کے گونگے نہیں، بہروں سے مراد وہ نہیں ہیں جن کو سنائی نہیں دیتا؛ بل کہ وہ سنتے بھی ہیں، دیکھتے بھی ہیں اور بولتے بھی ہیں؛ لیکن اس کے باوجود ان لوگوں کو اندھے، بہرے، گونگے اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ لوگ کان ہونے کے باوجود حق کو سننا نہیں چاہتے، زبان ہونے کے باوجود حق بولنا نہیں چاہتے، آنکھیں ہونے کے باوجود حق دیکھنا نہیں چاہتے۔

جیسا کہ اس بات کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے ایک اور جگہ کی ہے:

﴿ لَهُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا يَفۡقَهُوۡنَ بِهَا وَلَهُمۡ اَعۡيُنٌ لَّا يُبۡصِرُوۡنَ بِهَا وَلَهُمۡ آذَانٌ لَّا يَسۡمَعُوۡنَ بِهَا﴾ (ان کے پاس دل موجود ہیں؛ لیکن حق کو سمجھنا نہیں چاہتے اور ان کے پاس آنکھیں موجود ہیں؛ لیکن حق کو دیکھنا نہیں چاہتے اور ان کے کان بھی ہیں؛ لیکن حق کو سننا نہیں چاہتے) [الأعراف: ۱۷۹]

معلوم ہوا کہ مراد دل کا اندھا ہونا اور دل کا بہرا ہونا، دل کا گونگا ہونا ہے، ظاہری زبان بولتی ہے، ظاہری آنکھیں دیکھتی ہیں، ظاہری کان سنتے بھی ہیں؛ لیکن وہ اندر والی بات ان سے مفقود ہوتی ہے۔

اور قرآن میں ایک جگہ نہیں، دسیوں مقامات پر آپ کو اس قسم کے لوگوں کا ذکر ملے گا، جن کے اندر سے قبولِ حق کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے اور عام طور پر یہ کفار و منافقین ہوتے ہیں اور کفار یا منافقین ہی کے بارے میں یہ آیتیں بھی ہیں۔

دو طبقوں میں دو بیماریاں

اس دعا میں اللہ تعالیٰ سے یہ مانگا گیا ہے: اے اللہ! ہمیں حق، حق ہی دکھا اور اس پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔

حق کو حق نہ دیکھنا بھی بیماری ہے، حق کو حق دیکھنے کے باوجود قبول نہ کرنا بھی بڑی بیماری ہے، اس دعا کے اندر دونوں باتیں ہیں۔

''**اللّٰھم ارنا الحق حقاً**'' (اے اللہ! ہمیں حق حق ہی دکھا) اس میں اشارہ ہے کہ حق کو حق دیکھنا اچھا ہے اور حق کو حق نہ سمجھنا، یہ دل کی بیماریوں میں سے سب سے بڑی بیماری ہے۔ جیسے کافر لوگ حق کو حق نہیں سمجھتے تھے، اللہ کو ایک نہیں سمجھتے تھے، رسول کو رسول نہیں سمجھتے تھے، قرآن کو قرآن نہیں سمجھتے تھے اور اچھے کو اچھا سمجھنے کے بہ جائے بُری حرکتوں کو اچھا سمجھتے تھے، ان کو شرک بہت اچھا لگ رہا ہے، کفر بہت اچھا لگ رہا ہے، کیوں؟ اس لیے کہ بیماری ہے دل کے اندر اور وہ حق نہ سمجھنے کی بیماری ہے، اس لیے دعا میں ہے کہ ہمیں حق کو حق ہی دکھا، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم باطل کو حق سمجھ بیٹھیں۔

عام طور پر مشرکین کے اندر یہ بیماری تھی یعنی حق کو حق ہی نہیں سمجھتے تھے، وہ کفر کو اچھا اور توحید کو غلط سمجھتے تھے، شرک ان کے نزدیک بہت اچھی عبادت تھی اور توحید ایک معیوب چیز تھی اور تالیاں پیٹنا اور الٹی سیدھی حرکتیں ان کے ہاں نماز کا درجہ رکھتی تھیں اور نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اور صحابہ رضی اللہ عنہم جو نماز پڑھتے تھے اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ تو ان لوگوں کی بیماری یہ تھی کہ حق کو حق ہی نہیں سمجھتے تھے، باطل کو باطل ہی نہیں سمجھتے تھے، یہ ان لوگوں کی بیماری تھی۔

دوسری بیماری ہے حق کو حق سمجھنے کے باوجود قبول نہ کرنا۔ اسی زمانے میں ایک

اور طبقہ بھی تھا، وہ ہے یہود ونصاریٰ کا طبقہ، یہ وہ طبقہ تھا جو حق کو حق سمجھتا تھا؛ لیکن قبول نہیں کرتا تھا، ان لوگوں کو معلوم تھا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آنے والے ہیں، کتابوں میں پڑھتے تھے، درس ہوتا تھا، کتابوں میں لکھا ہوا تھا، توریت میں، انجیل میں وضاحت موجود تھی، صحائف میں بھی واضح ترین بات موجود تھی ، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سارا ریکارڈ (RECORD) موجود تھا۔

لیکن سب کچھ ہونے کے باوجود انہوں نے چاہا کہ لوگوں کے سامنے یہ بات نہ آئے اور تحریف کر ڈالی اور حق کو حق جاننے اور سمجھنے کے باوجود قبول نہیں کیا۔

تو دو بیماریاں ہیں: ایک نہ جاننے اور نہ سمجھنے کی بیماری اور دوسری جاننے اور سمجھنے کے باوجود قبول نہ کرنے کی بیماری۔ یہ دونوں بیماریاں روحانی اعتبار سے بڑی سخت ترین گمراہیاں ہوتی ہیں اور ہمیں ہمیشہ ان سے پناہ مانگتے رہنا چاہیے اور یہ دعا ہمیں بار بار مانگتے رہنا چاہیے؛ اس لیے کہ اس گمراہی سے بچنے کے لیے ہی یہ دعا سکھائی گئی ہے، اس بیماری سے شفا پانے کے لیے یہی دعا دوا ہے۔

حق کو حق سمجھنے کے باوجود قبول نہ کرنا بڑی گمراہی

جن دو بیماریوں (گمراہیوں) کا ذکر ہوا، ان میں زیادہ خطرناک گمراہی یہود ونصاریٰ کی گمراہی ہے؛ اسی لیے مشرکین کا حق کی طرف آجانا زیادہ مستبعد نہیں ہوا، زیادہ مشکل نہیں ہوا، برخلاف یہود ونصاریٰ کے، ان کا دین پر آنا بہت مشکل ہو گیا، کیوں؟ اس لیے کہ نہ سمجھنے والا جب سمجھنے لگے گا، تو قبول کر لے گا۔ مثلاً: ایک آدمی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ نجاست ہے، وہ سمجھا کہ کھانا ہے اور ادب سے کھانے کے لیے آکر بیٹھ گیا، اتنے میں آپ تشریف لے آئے اور کہا کہ میاں! کیا کر رہے ہو؟ یہ تو پاخانہ ہے، کھانے کی چیز نہیں ہے! اب اس نے دیکھا اور سمجھ کر اٹھ گیا، جوں ہی سمجھ

جائے گا، وہ فوراً توبہ کرے گا اور وہاں سے اٹھ جائے گا کیوں؟ اس لیے کہ اس کے اندر جو بیماری ہے، وہ حق کو حق نہ سمجھنے کی بیماری ہے، جب وہ سمجھنا شروع کرے گا، تو فوراً قبول بھی کرنا شروع کردے گا۔

اور دوسرا جو طبقہ تھا، یہود و نصاریٰ کا اس کی بیماری بہت سخت بیماری تھی، اس کی گمراہی خطرناک گمراہی تھی یعنی اسے سب معلوم تھا، اللہ کے نبی ﷺ کے اوصاف معلوم تھے، اسے پتہ تھا آپ ﷺ آنے والے ہیں، حتیٰ کہ ان کے درمیان انتظار بھی چل رہا تھا، جیسے کہ تاریخ، احادیث وسیرت کی کتابوں کے اندر بہت تفصیل کے ساتھ موجود ہے کہ ان کی مجالس کے اندر اس کے تذکرے اور اس پر تبصرے ہوتے رہتے تھے، یہاں تک کہ ان کے جو بڑے بڑے لوگ گذرے تھے، انہوں نے پیشن گوئیاں بھی دی تھیں۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور حق کی جستجو

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا واقعہ آپ کو معلوم ہوگا، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فارس کے رہنے والے تھے، بڑی عمر پانے والے صحابہ میں ان کا ذکر آتا ہے، ان کے والد مجوسی تھے اور آگ کے پجاری تھے اور وہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو بڑی ہی سخت ترین پابندیوں کے ساتھ رکھتے تھے کہ کہیں وہ کسی عیسائی راہب یا یہودی عالم کے پاس نہ چلے جائیں اور جا کر عیسائیت یا یہودیت قبول نہ کرلیں؛ اس لیے پابندی کے ساتھ رکھتے تھے۔

اس زمانے میں عیسائی مذہب ہی حق تھا؛ اس لیے کہ حضور ﷺ ابھی آئے نہیں تھے، حضور ﷺ کے آنے سے پہلے وہی مذہب حق تھا، جگہ جگہ یہ پادری لوگ موجود تھے اور ان کی گرجائیں (CHURCH) تھیں اور

ان کے راہب بھی تھے، جن کی خانقاہیں بھی ہوتی تھیں اوران کے اندر کچھ اچھی اچھی باتیں بھی تھیں، جو لوگوں کو سکھائی اور بتائی جاتی تھیں؛ اس کے باوجود بہت کچھ جھول و بگاڑ بھی پیدا ہو چکا تھا؛ لیکن بہرحال مذہبِ حق کے طور پر اس زمانے میں یہی ایک مذہب تھا۔

ایک مرتبہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے والد نے ان سے کہا کہ فلاں جگہ ایک کام ہے، تم جاؤ اور وہ کام کر کے جلدی سے آجاؤ؛ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نکلے اور جس کام کے لیے ان کو جانا تھا اس کی طرف چلنے لگے، راستے میں ان کو نظر آیا کہ کچھ لوگ (CHURCH) میں عبادت کر رہے ہیں، ان کو دیکھ کر بہت اچھا لگا، انہوں نے سوچا کہ یہ عبادت کا طریقہ تو اچھا ہے، ہم جو عبادت کرتے ہیں، وہ کیا عبادت ہے کہ آگ کے سامنے جھکتے ہیں اور آگ کے چکر لگاتے ہیں، کچھ دیر تک وہیں ٹھہرے رہے اور دیکھتے رہے اور اس میں دیر بھی ہوگئی، تو ان کے والد پریشان ہو گئے اور لوگوں کو دوڑایا کہ دیکھو سلمان کہاں ہے؟ کچھ لوگ آئے، دیکھا تو یہاں ہیں، اب وہاں سے ان کو لے کر گئے، ان کے والد نے ان پر بڑی سختی کی اور کہا کہ یہ کیا کیا تو نے؟ انہوں نے کہا کہ مجھے تو وہ طریقہ اچھا لگ رہا ہے اور ہماری عبادت کے اندر مجھے خامی نظر آرہی ہے، یہ سن کر باپ نے ان کو گھر میں بیڑی ڈال کر قید کر دیا۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نصاریٰ کے پاس ایک شخص کو بھیج کر معلوم کیا کہ عیسائی دین کا مرکز کہاں ہے؟ انھوں نے بتایا کہ اس کا مرکز ملکِ شام ہے، کہتے ہیں کہ میں نے ان لوگوں سے کہہ دیا کہ اگر کوئی وہاں سے یہاں آئے، تو مجھے اطلاع دینا۔ چناں چہ تاجروں کا ایک وفد آیا اور ان کو اطلاع ہوئی، تو انھوں نے اپنی بیڑیاں کھول کر وہاں سے راہِ فرار اختیار کی اور ملکِ شام پہنچ گئے اور وہاں معلوم کیا کہ یہاں بہترین راہب کون ہے؟ تو لوگوں نے ایک شخص کا پتہ دیا، آپ اس

راہب کے پاس گئے اور عیسائیت قبول کر لی؛ مگر وہ راہب بڑا بُرا شخص تھا، جو لوگوں سے فقرا و مساکین کے نام پر پیسے وصول کرتا اور ان کو دینے کے بجائے خود جمع کرتا تھا، جب اس کا انتقال ہو گیا، تو لوگ اس کو دفن کرنے آئے، حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے کہا یہ بہت بُرا آدمی تھا، لوگوں نے کہا: کیوں؟ فرمایا کہ یہ شخص تم لوگوں کو صدقے کی ترغیب دے کر پیسے وصول کرتا اور غریبوں کے بجائے خود جمع کر لیتا تھا، پھر آپ نے لوگوں کو لے جا کر اس کا جمع کردہ خزانہ دکھایا، یہ دیکھ کر لوگوں نے اس کو دفن بھی نہیں کیا اور سولی پر لٹکا کر پتھر مارا اور اس کی جگہ ایک اور راہب کو لائے، جو بڑا متقی اور نیک اور عبادت گذار تھا، اس نے ان کو اپنی خدمت میں رکھا اور عیسائیت کی تعلیم دی، سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ایک طویل زمانے تک اس کی خدمت میں رہے، جب اس کے انتقال کا وقت آیا، تو اس نے کہا کہ میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ میرے انتقال کے بعد فلاں جگہ پر ایک سچا راہب ہے تم اس کے پاس چلے جانا؛ کیوں کہ اس علاقے میں کوئی اور اچھا آدمی آپ کو نہیں ملے گا؛ اس لیے تم وہاں چلے جاؤ۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ چند دنوں کے بعد اس راہب کا انتقال ہو گیا، تو کفن دفن کے بعد وہاں سے نکل کر دوسرے راہب کے پاس چلے گئے، جس کا پتہ پہلے راہب نے دیا تھا، وہاں گئے اور جا کر ملاقات کے بعد پوری کیفیت بتائی، تو اس نے بھی ان کو قبول کیا اور اپنے ساتھ رکھ لیا اور اس کے پاس بھی وہ کئی سال تک رہے، جب اس کے انتقال کا وقت آیا، تو اس نے بھی اسی طرح کی وصیت کی، جس طرح کہ اس سے پہلے راہب نے کی تھی کہ میرے بعد تم فلاں شہر میں فلاں راہب کے پاس چلے جانا؛ کیوں کہ دنیا میں جھوٹے راہب بہت ہیں، وہ سچا راہب ہے، جب اس دوسرے راہب کا انتقال ہو گیا، تو بعد دفن کے وہ وہاں سے

بھی نکلے اور رختِ سفر باندھا اور تیسرے راہب کے پاس چلے گئے اور اس کے پاس بھی کئی سال تک رہے، جب اس کے انتقال کا وقت آیا، تو اس نے کہا کہ اس زمانے میں میرے سوا اور کوئی حق پر نہیں تھا، میں آخری راہب ہوں، جو مذہبِ حق پر قائم تھا، باقی سب لوگوں نے اس دین میں تحریف کردی ہے؛ اس لیے اگر تمہیں میرے بعد سچے مذہب پر قائم رہنا ہے، تو میری ایک وصیت ہے کہ آخری زمانے کے پیغمبر محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا زمانہ قریب ہو چکا ہے؛ لیکن میں یہ نہیں بول سکتا کہ وہ کب آنے والے ہیں؟ البتہ زمانہ ان کا قریب آتے ہوئے محسوس کرتا ہوں اور کہا کہ وہ حرم کی زمین سے ظاہر ہوں گے اور ہجرت کرکے کھجوروں والی بستی میں آکر رہیں گے، ان کی علامت یہ ہوگی کہ وہ ہدیہ تو لیں گے؛ مگر صدقہ قبول نہیں کریں گے اور ان کے دوشانوں کے درمیان ''مہرِ نبوت'' کندہ ہوگی۔ اس لیے اگر تم کھجوروں کی بستی میں جا کر رہو، وہاں وہ پیغمبر جب ظاہر ہو جائیں اور تمہاری ان سے ملاقات ہو جائے تو پھر ان کی خدمت کرنا۔

یہ اس راہب نے ان کو وصیت کی اور اس کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ پریشان رہے کہ میں کھجوروں والی بستی کو کہاں تلاش کروں؛ اس لیے کہ اس نے کھجوروں والی بستی کا نام نہیں بتایا تھا؛ کیوں کہ پرانی کتابوں میں توریت میں، انجیل میں اور دیگر صحائف میں جہاں محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ذکر موجود ہے، وہاں یہ لکھا ہوا موجود ہے کہ وہ مکے میں پیدا ہوں گے اور وہاں سے ہجرت کرکے کھجوروں والی بستی میں جائیں گے۔ اب کھجوروں والی بستی کہاں ہے؟ لوگوں سے پوچھتے رہے؛ لیکن لوگوں سے کچھ پتہ نہیں چلا۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ کچھ تاجر لوگ ایک جگہ سفر کی تیاری کر رہے تھے، تو سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟ تو انہوں نے کہا کہ ہم یثرب

جارہے ہیں کھجوروں والی بستی کی طرف، سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے فوراً کہا: اللہ کا واسطہ مجھے بھی ساتھ لے چلو، جو خرچ میرا ہوگا، وہ میں تم کو ادا کردوں گا۔ وہ تاجرین انھیں اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ ہوگئے۔ اب یہ قافلہ یہاں سے گیا اور ''مدینہ طیبہ'' جو اس وقت ''یثرب'' کے نام سے مشہور تھا، وہاں پر ان کو لے جا کر ان لوگوں نے چال بازی یہ کی کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو غلام کہہ کر بیچ دیا اور ان کو خریدنے والا ایک یہودی تھا۔ یہودی نے ان کو خرید کر اپنے باغ میں لے جا کر کام پر لگا دیا، ان کی خدمت یہ تھی کہ درختوں کو پانی ڈالیں اور صفائی کریں، کھجور توڑا کریں، یہ سب ان کی ذمہ داریوں میں تھا۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اپنا کام کرتے رہے اور انتظار بھی دل میں لگا ہوا تھا کہ وہ پیغمبر کب آئیں گے؟ وہ پیغمبر کب آئیں گے کہ جن کو دیکھنے کے لیے اتنے دور کا سفر کر کے آیا ہوں۔

ایک دن وہ کھجور کے درخت پر چڑھ کر کھجور توڑ رہے تھے کہ اتنے میں ایک آدمی اس یہودی کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ بھائی! کچھ خبر بھی ہے؟ کہا کہ کیا خبر ہے؟ کہا کہ ایک آدمی آیا ہے اور کہتا ہے کہ وہ مکے سے آیا ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ وہ نبی ہے اور لوگ ان کو گھیرے ہوئے ہیں اور سوال و جواب چل رہا ہے۔ بس اتنا کہنا تھا کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اوپر سے نیچے کو کود پڑے اور اس آدمی سے پوچھنے لگے کہ کیا واقعہ ہوا؟ ان کے مالک یہودی نے انھیں ایک تھپڑ مارا اور کہنے لگا کہ تجھے اس واقعے سے کیا مطلب؟ تو اپنا کام کر۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے تھوڑی بہت بات سن ہی لی تھی اور اندازہ تو ان کو ہو گیا تھا۔

جب شام کا وقت ہوا تو موقعہ دیکھ کر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کچھ کھجور ہاتھ میں لے کر پوچھتے ہوئے معلوم کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے، جہاں حضرت نبی کریم

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اترے ہوئے تھے، دیکھا تو بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اور حضرت محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم درمیان میں تشریف فرما ہیں۔ سلمان فارسی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کہتے ہیں کہ میں اللہ کے نبی کے سامنے گیا اور کھجور لے جا کر سامنے رکھ دیا۔

اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ کہا: آپ کے لیے صدقہ ہے، آپ نے فرمایا کہ اس کو اٹھالو، ہم صدقہ نہیں کھایا کرتے۔ کہتے ہیں کہ میں کچھ دیر بیٹھا رہا اور باتیں بھی سنتا رہا اور واپس چلا آیا؛ پھر جب دوسرا دن ہوا، تو پھر پہنچ گیا، محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں اور آج بھی کچھ کھجور لے گیا تھا، سامنے رکھا۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے پھر پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ عرض کیا کہ یہ آپ کے لیے ہدیہ لایا ہوں، تو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: ہاں ہم ہدیہ کھاتے ہیں، یہ کہہ کر حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے خود بھی کھایا، اوروں کو بھی کھلایا۔

یہ انہوں نے کیوں کیا تھا؟ اس لیے کہ جس پادری نے سلمان فارسی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے بارے میں خبر دی تھی، اس نے محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی کچھ نشانیاں بتائی تھیں کہ آخری پیغمبر جو آئیں گے وہ کچھ نشانیاں بھی اپنے اندر رکھیں گے، ان میں سے ایک نشانی یہ ہوگی کہ وہ صدقہ نہیں کھائیں گے، ہاں ہدیہ کھائیں گے۔ یہ جانچنے کے لیے انہوں نے ایسا کیا تھا۔ اس طرح ان کو تصدیق ہوگئی۔

پادری راہب نے ان کو آخری پیغمبر کی ایک نشانی یہ بھی بتائی تھی کہ ان کی پشت پر "مہرِ نبوت" بھی ہوگی یعنی قدرتی طور پر "**محمد رسول اللّٰہ**" لکھا ہوگا، یہ بھی تم دیکھ لینا، سلمان فارسی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کہتے ہیں کہ میں "مہرِ نبوت" دیکھنے کی نیت سے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پیچھے کی طرف کھسک کھسک کر آگے بڑھا، تو اللہ کے نبی

صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے پہچان لیا کہ میں کیوں آرہا ہوں؛ اس لیے آپ نے ذرا سی چادر اپنی پشت سے ہٹالی تاکہ میں دیکھ لوں۔ کہتے ہیں کہ میں نے مہرِ نبوت دیکھ لی اور پھر اس کے بعد اٹھ کر سامنے آگیا اور ایمان قبول کرلیا۔

(اس واقعے کی تفصیلات کے لیے دیکھو: سير أعلام النبلاء للذهبي: ۱/۴۵۱- ۴۵۹، تاريخ الاسلام للذهبي : ۱/۹۶-۱۰۲، تاريخ بغداد : ۱/۱۶۵-۱۶۹)

آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو پہلے مشرکین نے قبول کیا

بہر حال! یہ واقعہ ہوا، میں اس سے یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس طریقے پر یہود ونصاریٰ کے درمیان آخری پیغمبر کی آمد کے تبصرے اور تذکرے اور اس کے بارے میں باقاعدہ انتظار اور جستجو، درس و دروس چلا کرتے تھے، یہاں تک کہ مشرکینِ مکہ نے یہود ونصاریٰ سے آخری زمانے کے پیغمبر کے بارے میں جو سن رکھا تھا، اس کی وجہ سے جب اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم آئے، تو پہلے مشرکینِ مکہ نے ایمان قبول کیا؛ اس لیے کہ ان کو اندازہ ہوگیا کہ یہی پیغمبر ہیں؛ اس لیے جب انہوں نے دیکھا اور سمجھ لیا، تو قبول کرلیا؛ لیکن یہود ونصاری پیچھے رہے، یعنی اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی کیفیات اور ان کے حالات اور آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے نشانات ان سب چیزوں کو جانتے بوجھتے چھپایا اور حق کو قبول نہیں کیا؛ اس لیے ان کا جُرم زیادہ بڑا ہے۔

قرآن نے یہود ونصاریٰ کو اہلِ کتاب کیوں کہا؟

قرآنِ کریم میں جگہ جگہ یہود ونصاریٰ کا ذکر ہے، آپ قرآن کو اٹھا کر پڑھیں

گے ،تو اندازہ ہوگا کہ قرآنِ کریم مشرکینِ مکہ کو تو ''اُمی'' کہتا ہے؛ اس لیے کہ وہ پڑھتے نہیں تھے اور پڑھنا جانتے ہی نہیں تھے، نہ لکھنا جانتے تھے۔ عرب کی سرزمین پر لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد اتنی کم تھی کہ انگلیوں پر گنے جاتے تھے؛ لیکن یہود و نصاریٰ تو پڑھنے پڑھانے والے تھے، ان کو قرآنِ کریم '' أهل الكتاب'' کہتا ہے، کیوں؟ اس لیے کہ وہ جاننے والے تھے، سمجھنے والے تھے، کتاب والے، پڑھنے والے، لکھنے والے، درس دینے والے، تحقیق کرنے والے تھے، ایسا بالکل نہیں تھا کہ وہ اللہ کے نبی کو نہ جانتے ہوں، نہ پہچانتے ہوں؛ بل کہ وہ اچھی طرح جانتے تھے؛ اسی لیے قرآن میں ایک جگہ ان کے بارے میں فرمایا گیا ہے: ﴿يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ أَبْنَائَهُمْ﴾ (وہ ایسا اللہ کے نبی کو پہچانتے ہیں جیسے کہ وہ لوگ اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں) [البقرة:١٤٦]

اولاد کو دیکھ کر کوئی آدمی اشتباہ میں مبتلا نہیں ہوتا کہ یہ میرا بیٹا ہے یا نہیں ہے؟ اسے تو یقیناً معلوم ہوگا کہ یہی میرا بیٹا ہے، ہزاروں میں پہچانا جاتا ہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہودیوں کو بھی اسی طرح کی پہچان موجود تھی؛ لیکن قبولیت کا مادہ ان میں موجود نہیں تھا؛ اس لیے کہ مفاد نے آکر ان کو روک دیا تھا۔ وہ مفاد کیا تھا؟ وہ یہ کہ انہوں نے سوچا کہ اگر اس بات کو ہم قبول کر لیتے ہیں، تو ہماری سرداری ختم ہو جائے گی؛ کیوں کہ اللہ کے نبی کو نبی مان لینے کے بعد تو بڑے وہ ہو گئے اور سکہ ان کا چلے گا، دعوت ان کی چلے گی، پیغام ان کا چلے گا اور لوگ ان کی بات قبول کر لیں گے، تو پھر ہماری کیا چلنے والی ہے؟

معلوم ہوا کہ علم تھا ان کے پاس، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت تھی ان کے پاس، پھر بھی اس لیے قبول نہیں کیا کہ مفاد پر زد پڑنے والی تھی، اسی مفاد پرستی کی

وجہ سے حق کا انکار کرتے تھے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مذکورہ دو طبقے گمراہ تھے، ایک جاہل، جو نہ جاننے والا طبقہ ہے، دوسرا عالم جو جاننے کے باوجود قبول نہ کرنے والا طبقہ ہے۔

بھائیو! یہ دونوں باتیں سخت گمراہی کی ہیں، سخت ترین بیماریاں ہیں، جن سے بڑی بڑی گمراہیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ حق کو سمجھنے کی کوشش اور اس کے ساتھ اس کو قبول کرنے کی صلاحیت یہ دونوں چیزیں اپنے اندر پیدا کریں۔

کافروں کی صفت آج ہم میں آ گئی

بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم جیسے لوگوں کے اندر بھی حق کو قبول نہ کرنے کی صفت پیدا ہو جاتی ہے، جیسے بہت ساری غیروں کی صفات مؤمن اختیار کر لیتے ہیں، جس کی مثال یہ حدیث ہے، جس میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا:

﴿مَنْ تَرَکَ الصَّلٰوۃَ مُتَعَمِّداً فَقَدْ کَفَرَ﴾

(جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی اس نے کفر کیا)

(مجمع الزوائد: ۱۶۳۴)

اس حدیث میں کفر کا مطلب کافروں جیسی حرکت کرنا ہے یعنی نماز چھوڑنا کافروں کی حرکت ہے، مؤمنوں کی حرکت نہیں، معلوم ہوا کہ تارکِ صلوۃ ہے تو مسلمان، اسے کوئی کافر تو نہیں کہتا، کوئی بھی امام اس کو کافر نہیں کہتا، کتنی بڑی مخلوق ہے؟ جو نماز نہیں پڑھتی، لیکن ان کو کافر نہیں کہا جاتا، مؤمن ہیں وہ، ان کو کافر کہنے والے تو، معتزلہ ہیں یا خوارج فرقے کے لوگ ہیں، جو کہتے ہیں کہ یہ ایمان سے خارج ہو گئے۔ لیکن اہلِ سنت کا مسلک یہ ہے کہ نماز نہ پڑھنے سے آدمی مؤمن باقی

رہتا ہے، ہاں! گنہ گار ہو جاتا ہے۔

اسی طرح کافروں کی جو حرکت کبھی مسلمان کرنے لگتا ہے، تو اس کے کرنے سے ہم یہ تو نہیں کہیں گے کہ کافر ہو گیا؛ لیکن کہیں گے کہ یہ کافرانہ حرکت ہے۔

اس کی ایک اور عام فہم مثال دیتا ہوں: جیسے کوئی بچہ یا کوئی بھی آدمی گدھے جیسی حرکت کرنے لگے مثلاً: زور زور سے چیخنے لگے، تو کہتے ہیں کہ کیا تو گدھا ہو گیا؟ یا یہ بھی کہہ دیتے ہیں: ارے گدھے! کیا کر رہا ہے؟ یعنی گدھے والی حرکت کی ہے۔ یہ گدھا تو ہوا نہیں؛ بل کہ انسان ہی ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ حق کو قبول نہ کرنے کی صفت، ہے تو کافروں کی، منافقوں کی، لیکن کبھی کبھی ہم جیسے لوگ بھی اس کو اختیار کر کے وہی حرکت کر لیتے ہیں۔ آج ہم لوگوں کے اندر جہاں بہت ساری بیماریاں ہیں اور بہت ساری قابلِ اشکال باتیں ہیں، وہیں پر یہ دونوں بیماریاں بھی مسلمانوں کے اندر چل رہی ہیں۔

ہم میں مشرکین کی صفت

مشرکینِ مکہ کی جو صفت تھی یعنی لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے حق قبول نہ کرنے کی صفت، جس کی وجہ سے قرآن نے انہیں اُمی کہا کفارِ مکہ کو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے سے پہلے لوگوں نے بہکا رکھا تھا اور اسی بہکاوے میں وہ لوگ چلے جا رہے تھے، عینِ شرک کو انہوں نے عبادتِ خداوندی قرار دے دیا تھا، یہاں تک کہ "کعبۃ اللہ" جس کو سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے اللہ کا گھر بنایا تھا، اس گھر کو انہوں نے شرک کا اڈہ بنا دیا اور اس کے اندر تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے، جس کو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فتحِ مکہ کے موقع پر نکالا تھا اور کعبۃ اللہ کا طواف کرنے جاتے تھے، تو ننگے ہو کر جایا کرتے تھے، کیوں؟ اس کا

جواب ان کے پاس یہ تھا کہ ہم ان کپڑوں کے اندر گناہ کیا کرتے ہیں، تو اللہ کے گھر کا طواف ایسے کپڑوں میں کیسے کریں، جن کپڑوں میں ہم گناہ کر لیتے ہیں؛ لیکن ان بے وقوف جاہلوں کو اتنی بات سمجھ میں نہیں آئی کہ کپڑوں نے نہیں؛ بل کہ خود ان لوگوں نے گناہ کیے ہیں، اس میں کپڑوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ آپ نے چشمہ لگایا اور ایک لڑکی کو دیکھ لیا، تو اس میں قصور آپ کا ہے یا چشمہ کا؟ آپ نے کہا کہ بھائی! یہ چشمہ بہت بُرا ہے، اس کو پھینکو (لاحول ولا قوۃ إلا باللہ) "کرے کوئی پٹے کوئی" کا قصہ ہے۔

چناں چہ اس طرح انہوں نے دین کو بگاڑا، نہ ان کو کوئی سمجھ تھی، نہ عقل تھی، بس کچھ لوگوں کی دیکھا دیکھی الٹا سیدھا کرتے چلے جا رہے تھے۔

یہی مشرکینِ مکہ کی صفات، وہی جہالت آج مسلمانوں میں بھی ہے اور غیر مسلموں کی بہت ساری صفات ہمارے اندر سرایت کر گئی ہیں۔

ہم میں ایک طبقہ ایسا ہے، جو قرآن نہیں پڑھتا، حدیث بھی نہیں پڑھتا، کتابیں بھی نہیں پڑھتا، بس کچھ پیروں کے دامِ فریب میں آ گیا ہے، کچھ بزرگوں کو پکڑ لیا ہے، وہ بزرگ بھی ویسے ہی جاہل اور اناڑی ہیں، وہ الٹا بولیں کہ سیدھا بولیں، سچ بولیں کہ جھوٹ بولیں، قرآن کے خلاف بھی بولیں تو چلے گا، دین کے خلاف بھی بولیں تو بھی چلے گا، ان کو حق سمجھنا ہی نہیں ہے۔

پیروں کا طواف ایک دھوکہ۔ ایک فریب

اس طبقے کے ایسے ایسے واقعات سننے میں آتے رہتے ہیں اور سن کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک مؤمن، ایک اللہ کو ماننے والا، رسول اللہ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر یقین رکھنے والا کیا ایسے لوگوں کی بات مان سکتا ہے؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مانتے ہے مثلاً یہ

کہ ایک آدمی کہیں پیر بن کر بیٹھ جارہا ہے اور کہتا ہے کہ میرا طواف کرنا کعبۃ اللہ سے ستر گُنا زیادہ فضیلت رکھتا ہے اور لوگ ہیں کہ اس کا طواف کررہے ہیں، بنگلور میں ہورہا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ بعض لوگ اس قسم کے پیروں کے پاس گھر بیٹھے حج بھی کرتے رہتے ہیں، خیالی حج، بس آپ حج کو جائیں گے، تو دولاکھ خرچ ہوں گے، وہ کہتا ہے کہ دولاکھ خرچ کرنے کی ضرورت نہیں، پچاس ہزار مجھے دے دو، تو یہیں بیٹھے بیٹھے حج ہوجائے گا۔ کیسے؟ کہتے ہیں کہ لوگوں کو بٹھا دیا جاتا ہے اور وہ پیر کہتا ہے کہ بھائی! سب آنکھیں بند کرلیں، پھر کہتا ہے کہ اب یہ تصور کرو کہ میں فلائیٹ (FLIGHT) میں بیٹھ گیا ہوں، اب یہ تصور کرو کہ میں فلاں جگہ پہنچ گیا ہوں، جدہ میں اتر رہا ہوں اور پھر وہاں سے آگے بڑھ رہا ہوں اور مکے شریف لے گیا ہوں اور کعبے کے سامنے پہنچ گیا ہوں، اب میں طواف کررہا ہوں، اب میں فلاں اور فلاں کام کررہا ہوں اور اس طرح پندرہ بیس منٹ کے اندر حج کرکے تشریف لے آتے ہیں۔

اتنی بے وقوفانہ واحمقانہ حرکت؟ بھائیو! تعجب ہوتا ہے کہ قرآن وحدیث کے دلائل پر دلائل دے کر عوام کے سامنے پیش کیا جاتا ہے؛ لیکن عوام اس کو ماننے کے سلسلے میں اتنا آگے نہیں بڑھتی؛ لیکن اس قسم کے پیروں کی ایسی احمقانہ اور بے ہودہ بات کو لوگ قبول کرکے پچاس پچاس ہزار روپیے دے کر لوگ حج کررہے ہیں اور اپنے دین کو بھی برباد کررہے ہیں۔

تو بھائیو! یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے اندر بھی اس قسم کے لوگ ہیں، جنہوں نے حق کو نہیں سمجھا، اللہ نے انہیں کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ﴾ (بہرے، گونگے، اندھے)

یہ ایسے ہی لوگ تو ہیں؟ ہم انہیں کافر تو نہیں کہتے؛ لیکن کافرانہ حرکت تو ہے؟

مشرکانہ حرکت ہے۔

ہم میں یہودیوں کی صفت

دوسرا طبقہ ہم میں وہ ہے جو پڑھتا ہے، لکھتا ہے اور جانتا ہے، سمجھتا ہے؛ لیکن اس کے باوجود اس کے یہاں دین کو غلبہ نہیں ہے، حق کو غلبہ نہیں ہے۔

جی ہاں ! مدارس بھی ہیں، ہمارے پاس تحریکیں ہیں ، ہمارے پاس انجمنیں ہیں، ہمارے پاس جماعتیں ہیں ، ہمارے پاس مختلف ادارے ہیں؛ لیکن سب کو آپ دیکھتے جائیے، سب کچھ موجود ہوگا؛ لیکن ان کے پاس دین کو غلبہ نہیں ہوگا۔

میرے الفاظ کو نوٹ کریں، کہیں کوئی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو، میں کہہ رہا ہوں دین ہے؛ لیکن دین کو غلبہ نہیں ہے، دین کو غلبہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ میرا ادارہ چلے کے نہ چلے، بہر حال دین کو غلبہ رہے، حق کو غلبہ رہے؛ لیکن اب ایسا نہیں ہے؛ بل کہ ایسا ہے کہ دین چاہے رہے کہ نہ رہے؛ لیکن میرا ادارہ باقی رہے، میری انجمن باقی رہے، میرا مدرسہ باقی رہے۔ (میری جماعت میں جو ہوگا، وہ حق ہوگا ، میری تنظیم کا دائرہ حق کی پہچان ہوگا، میرے ادارے میں جو بھی ہوگا، وہ صحیح ہی ہوگا۔)

ایسا سوچنے والے ہزاروں نہیں لاکھوں ملیں گے کہ دین چاہے کچھ بھی ہوجائے؛ لیکن میری انجمن قائم رہے۔ یہ تو وہی بیماری ہے، جو بیماری یہود ونصاریٰ میں تھی، یہ یہود ونصاریٰ کی بیماری ہم میں پل رہی ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے چودہ سو برس پہلے یہ پیشن گوئی فرمائی تھی:

’’لَتَسْلُكُنَّ سُنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ‘‘ (ضرور بالضرور تم ان لوگوں کے نقشِ قدم پر چلو گے، جو تم سے پہلے گذر گئے، جیسے ایک جوتا دوسرے جوتے کے برابر ہوتا ہے) (مجمع الزوائد: ۱۲۱۰۰)

اس حدیث میں جو "من" آیا ہے، یہ عام ہے سب کے لیے یعنی بنی اسرائیل کے نقشِ قدم پر، یہود ونصاریٰ کے نقشِ قدم پر، مشرکین کے نقشِ قدم پر چلو گے، ہاں! بعض احادیث میں بنی اسرائیل کا بھی ذکر ہے اور بعض احادیث کے اندر یہود ونصاریٰ کے الفاظ آئے ہیں، یہود ونصاریٰ تو بنی اسرائیل ہی ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ تم لوگ پہلے لوگوں کے نقشِ قدم پر بالکل اسی طرح چلو گے، جیسے ایک جوتا دوسرے جوتے کے برابر ہوتا ہے، ایک جوتا دوسرے جوتے کے برابر ہی ہوتا ہے نا؟ سائز میں بھی، انداز میں بھی، نقش ونگار میں بھی، ڈیزائن میں بھی، بالکل اسی طریقے پر تم بھی انہیں کے نقشِ قدم پر چلو گے یعنی جیسے انہوں نے کیا ویسے تم بھی کرو گے۔ ایک دوسری حدیث میں یہاں تک فرمایا گیا ہے: اگر ان لوگوں میں کوئی ایسا شخص گذرا ہے، جس نے اپنی ماں سے منھ کالا کیا ہے، تو تم میں بھی ایسا آدمی پیدا ہو جائے گا۔ (ترمذي: ۲٦٤١)

معلوم ہوا کہ یہ صورتِ حال جو میں نے عرض کی کہ کچھ لوگ دین کو سمجھتے نہیں، حق کو سمجھتے نہیں؛ جب کہ کچھ لوگ حق کو سمجھتے ہیں؛ لیکن حق کو غلبہ نہیں دیتے، اپنے مفادات دیکھتے ہیں، اپنے مختلف انفرادی یا اجتماعی یا معاشرتی کسی نہ کسی قسم کے فوائد اور منافع مدنظر ہوتے ہیں۔ یہی وہ بیماری ہے، جو بنی اسرائیل میں موجود تھی، وہ لوگ بھی مفاد پرستی کی خاطر حق کو قبول نہیں کرتے تھے، افسوس! کہ ہم میں بھی وہی مفاد پرستی آ گئی ہے، آج ہم میں بھی وہ لوگ ہیں، جو ان کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔

ہمارے اندر یہ بیماری نہیں ہونا چاہیے، حق سامنے آئے قبول کیجیے، دین سامنے آئے، دین کو غلبہ دیجیے، میرا دُکان برباد ہو جائے؛ لیکن دین قائم رہے، میرا گھر برباد ہو جائے؛ لیکن دین زیر نہ ہو، میرے ادارے تباہ ہو جائیں؛ لیکن دین کو بلندی

مل جائے، میری ذات ومفاد پر زَد پڑ جائے؛ لیکن دین غالب رہے۔ یہ ہمارا نظریہ اور ہماری فکر ہونی چاہیے اور یہی فکر پیدا کی تھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان۔

مسلمان ہار گیا؛ مگر اسلام جیت گیا- ایک واقعہ

ایک واقعہ یاد آ گیا اور یہ کوئی بہت پرانا واقعہ نہیں ہے ؛بل کہ ہمارے ہندوستان ہی کے ایک بزرگ کا واقعہ ہے۔ ''کاندھلہ'' جو حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحب رحمہ اللہ کی بستی ہے، اس بستی میں ان حضرات سے بہت پہلے مفتی الٰہی بخش کاندھلوی رحمہ اللہ گذرے ہیں، جو اپنے زمانے کے بہت بڑے اولیاء اللہ میں سے تھے اور بہت بڑے عالم بھی تھے، مفتی تھے، ان کا واقعہ ہے کہ ان کی بستی کاندھلہ میں ایک زمین کے بارے میں جھگڑا ہو گیا، جھگڑا یہ تھا کہ مسلمان کہتے تھے کہ یہ زمین ہماری ہے اور اس پر ہمیں مسجد بنانی ہے اور ہندوؤں کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ زمین ہماری ہے اور اس پر ہمیں مندر تیار کرنی ہے اور یہ جھگڑا طول پکڑتے پکڑتے مار پٹائی اور بہت آگے تک پہنچ گیا، جب بہت آگے بڑھ گیا، تو کورٹ (COURT) میں مقدمہ چلا، کورٹ والوں نے بھی اسے حل کرنے کی بہت کوشش کی؛ لیکن ان سے بھی حل نہیں ہوا، اس لیے کہ نازک ترین مسئلہ تھا، دو قوموں کا مسئلہ تھا، اگر فیصلہ ان کے حق میں کریں، تو یہ شور کریں گے اور اگر ان کے حق میں کریں، تو وہ شور کریں گے، آخر کار جب کوئی حل نہ نکل سکا، تو کورٹ نے دونوں فریق کو بلایا اور کہا کہ بھائی ہم نے تو بڑی کوشش کی تمہارے مسئلے کو سلجھانے کی؛ لیکن ہم سے تو نہیں ہو رہا ہے؛ اس لیے ہماری گذارش یہ ہے کہ تم دونوں فرقے والے کسی ایک شخصیت پر اتفاق کر لو اور اس کو حکم تسلیم کر لو،

اگر تم دونوں کسی ایک شخصیت پر متفق ہو گئے، تو وہ جو فیصلہ کریں گے، تم دونوں کو ان کا فیصلہ ماننا پڑے گا۔

مسلمانوں نے کہا کہ ہم تو ہمارے علاقے کے سب سے بڑے عالم، اللہ والے ''حضرت مفتی الٰہی بخش صاحب رحمہ اللہ'' کو اپنا حکم بنانا چاہتے ہیں، یہ سنتے ہی وہاں بیٹھے ہوئے ہندو لوگوں نے بھی کہا کہ ہم بھی ان کو ہی اپنا حَکَم تسلیم کرنے پر تیار ہیں، وہ شخصیت ایسی تھی کہ دونوں نے ان پر اتفاق کر لیا۔ اب کورٹ والوں کا بھی مسئلہ حل ہو گیا؛ لہٰذا مفتی صاحب کو اطلاع بھیجی گئی کہ یہاں دونوں فریقین نے آپ کو حکم تسلیم کیا ہے، لہٰذا آپ تشریف لائیں، دونوں کی بات سنیں اور سننے کے بعد جو بھی آپ فیصلہ دیں گے اس کو دونوں فریقین ماننے اور تسلیم کرنے تیار ہیں۔

اب مفتی صاحب وقتِ مقررہ پر تشریف لائے اور اب تک جو کچھ بھی کار روائیاں ہوئی تھیں، اس کو مفتی صاحب کی نظر سے گذارا گیا، اس کو انہوں نے ملاحظہ کیا اور پھر دونوں کے بیانات سنے اور سب کچھ اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کے پاس اس سلسلے میں کوئی خاص دلیل موجود نہیں ہے اور ہندوؤں کے پاس دلیل موجود ہے؛ لہٰذا اب تک جو معاملات اور دستاویزات میرے سامنے آئے، ان تمام چیزوں کو دیکھنے کے بعد انہیں کی بنیاد پر اب میں یہ فیصلہ دیتا ہوں کہ یہ زمین مسلمانوں کی نہیں؛ بل کہ ہندوؤں کی ہے۔

بس مسلمان خاموش ہو گئے اور ان کافروں نے لڈو تقسیم کیے۔ مسلمان کچھ کہہ تو نہیں سکتے تھے؛ اس لیے کہ انہوں نے پہلے ہی مفتی صاحب رحمہ اللہ کے فیصلے سے راضی ہونے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اب اس کے بعد کورٹ میں اس پورے فیصلے کی

روداد لکھی گئی اور تمام باتیں اس میں لکھی گئیں کہ ایسا ایسا ہوا اور اخیر میں اس لکھنے والے نے یہ لکھا کہ اس فیصلے کا حَکَم جناب مفتی الٰہی بخش صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ کو بنایا گیا اور انہوں نے اس پورے قضیے کی چھان بین کے بعد ہندوؤں کے حق میں فیصلہ لکھ دیا، جس پر مسلمان بھی راضی ہو گئے اور پھر اس کے بعد اس نے یہ تاریخی جملہ لکھا: ''مفتی صاحب کے اس فیصلے کی وجہ سے اگرچہ مسلمان ہار گئے؛ لیکن اسلام جیت گیا''۔

یہ حق پرست لوگ تھے، قبولِ حق کی صلاحیت موجود تھی یہی وہ نکتہ ہے، جو سمجھانا چاہتا ہوں کہ قبولِ حق کی صلاحیت انسان کے اندر ہونا ضروری ہے، ایک ہے سمجھنے کی صلاحیت اور ایک ہے قبولیت کی صلاحیت۔ اب دیکھیے یہاں بھی یہی ہوا کہ مسلمان ہار گئے؛ لیکن اسلام جیت گیا۔ خلاصہ یہی ہے کہ ہم سب کے سب لوگ اپنے دلوں میں اسلام کو آگے رکھنے، اسلام کو غالب رکھنے، حق کو غالب رکھنے، حق کو قبول کرنے کی فکریں اپنے اندر پیدا کریں، باقی اپنے مفادات کی طرف کبھی نہ جائیں۔

چار چیزیں حق
قبول کرنے سے
روکتی ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چار چیزیں حق قبول کرنے سے روکتی ہیں

قال النبي صلی اللہ علیہ وسلم :اَللّٰھُمَّ اَرِنَاالْحَقَّ حَقاً وَارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلاً وَارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ. (تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۷۵)

(اے اللہ! ہمیں حق کو حق ہی دکھا اور اس کے اتباع کی توفیق عطا فرما اور باطل کو باطل ہی دکھا اور اس سے بچنے کی توفیق عطا فرما)

آج کی مجلس میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ آدمی حق کو قبول کیوں نہیں کرتا؟ حق کو قبول نہ کرنے کی وجوہات کیا ہوتی ہیں؟ یہ بھی بہت اہم چیز ہے، سمجھنے کی ہے؛ اس لیے کہ آج ہمارا جو ماحول ہے، اس ماحول میں گمراہیاں ہیں، فتنے ہیں اور حق سے روگردانیاں ہیں، ایسے حالات کے اندر ہمیں اپنے آپ کو سنبھالنے کی بھی ضرورت ہے؛ تا کہ ہم بھی حق پر جمے رہیں اور دوسروں کو بھی حق پر جمانے کی کوشش کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔ بیماری کے اسباب جب تک نہیں سمجھیں گے، بیماری کا علاج بھی معلوم نہیں ہوگا؛ اسی لیے ڈاکٹر لوگ اور اطبا حضرات جب ان کے پاس کوئی مریض جاتا ہے، تو سب سے پہلے وہ یہ تشخیص کرتے ہیں کہ بیماری کیا ہے؟ بیماری کی تشخیص ہونے کے بعد پھر یہ تشخیص ہوتی ہے کہ یہ بیماری کیوں آئی اور اس کے اسباب کیا ہیں؟ اسباب معلوم کرنے سے بیماری کا علاج کرنا آسان ہوجاتا ہے۔

جیسے مثال کے طور پر بخار آیا، بخار تو سردی سے بھی آتا ہے اور گرمی سے بھی؛ لہٰذا بخار کا علاج اگر ڈاکٹر کرنا چاہے، تو پہلے اسے معلوم کرنا پڑتا ہے کہ بخار کس وجہ

اور کس سبب سے آیا ہے، پہلے وجوہات اور اسباب تلاش کرے اور اسباب کے معلوم ہو جانے کے بعد اسی کے مطابق وہ علاج کرے گا، تو ان شاء اللہ فائدہ ہوگا۔

اس کے برخلاف بخار آیا تھا گرمی سے اور ڈاکٹر صاحب نے سمجھ لیا کہ وہ سردی کی وجہ سے آیا ہے، اس لیے اب سردی کی دوائی دینی شروع کر دی یا اس کے برعکس ہوا، تو نتیجہ ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'' والا قصہ ہو جائے گا۔

وجہ صرف یہ ہے کہ اسباب نہیں معلوم تھے، اسباب معلوم ہو جاتے، تو علاج صحیح ہو جاتا؛ اسی طرح ہر بیماری کے علاج سے پہلے ضروری ہوتا ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ اس کے اسباب کیا ہیں؟ ہم بھی اپنے اندر ٹٹولیں اور دیکھیں کہ وہ بیماریاں اور وہ بیماری کے اسباب کہیں ہمارے اندر تو نہیں پل رہے ہیں؟ اگر خدانہ خواستہ ہمارے اندر بھی وہ علتیں ہوں، وہ بیماریاں ہوں اور بیماریوں کے وہ اسباب پائے جا رہے ہوں، تو ہمیں سب سے پہلے اپنی فکر کرنی چاہیے اور اپنے اندر سے ان وجوہات و اسباب کو دفع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

حق قبول نہ کرنے کی پہلی وجہ: جہالت

استقرا اور تلاش و جستجو سے اس کے چند اسباب سامنے آتے ہیں: سب سے بڑا سبب ہے ''جان کاری'' کا نہ ہونا کہ آدمی کے اندر جہالت ہے، حق اور باطل کی تمیز نہیں ہے، اچھے اور برے کی پہچان نہیں ہے، سنت اور بدعت کا فرق نہیں ہے، اسلام اور کفر میں کوئی تمیز نہیں ہے، سفید اور کالے کی پہچان نہیں ہے، اب یہ بے چارہ کیا کرے گا؟ اسے آپ رات کو دکھا کر کہیں کہ دیکھو صاحب! دن ہو گیا ہے، تو وہ کہے گا کہ ہاں ہاں اچھا یہی ہے دن؟ ٹھیک ہے ٹھیک ہے؛ اس لیے کہ اس بے چارے کو یہی پتہ نہیں ہے کہ رات کیا ہے اور دن کیا ہے اور آپ کسی کالی چیز کو بتائیں

اور کہیں کہ دیکھیے یہی سفید ہے وہ کہے گا کہ ہاں ایسے ہی ہوگا شاید، اب اس کے ذہن میں یہ بیٹھ جائے گا کہ سفید اس کالے کو کہتے ہیں۔

جیسے بعض لوگوں نے بہت سارے لوگوں کو یہ بتا رکھا ہے کہ بدعت ہی دراصل سنت ہے اور اہلِ بدعت ہی حقیقت میں اہلِ سنت ہیں۔ایسا ہی ہے نا بھائی؟ اگر میں یہاں کہوں کہ اہلِ سنت کی ایک مسجد میں بیان ہو رہا ہے، تو آپ لوگ کہاں جائیں گے؟ سیدھے نکل کر اہلِ بدعت کی مسجد میں جائیں گے، آپ کو اچھا معلوم بھی ہوگا کہ یہ بدعتی ہیں، خرافاتی ہیں اور رسومات کا ان کے پاس ایک لمبا چوڑا سلسلہ ہے اور شریعت کی خلاف ورزیاں ہیں؛ لیکن اہلِ سنت کہتے ہی فوراً آپ کا ذہن انہیں کی طرف جائے گا؛ لیکن جو حقیقی اہلِ سنت ہیں، ان کی طرف آپ کا دماغ جانے کا نہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ بدعت کو سنت قرار دینے کے لیے اور اہلِ بدعت کو اہلِ سنت قرار دینے کے لیے اتنا پروپیگنڈا کیا گیا کہ ہم جیسے لوگ تو خیر الحمد للہ سمجھ جاتے ہیں؛ مگر دماغ جاتا ہے، تو اُدھر ہی جاتا ہے۔

الغرض! بتانا یہ ہے کہ جہالت کی وجہ سے آدمی باطل کو حق اور حق کو باطل سمجھ بیٹھتا ہے اور اس طرح حق سے دور ہو کر گمراہی کے دَل دَل میں پھنس جاتا ہے؛ اس لیے علم ہونا ضروری ہے، ورنہ کبھی حق کا راستہ نہیں مل سکتا۔ شیطان جس راستے پر لے جائے گا، اسی راستے پر وہ چل پڑے گا، حتی کہ غلط کو صحیح اور صحیح کو غلط جان لے گا۔

ایک لطیفہ

میں آپ کو ایک لطیفہ سناؤں، جو ہمارے ہاں پیش آیا تھا، بہت سال پہلے جب ہمارا مدرسہ بیدواڑی میں تھا، آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہماری مسجد میں باہر ''مسجدِ بید جمعیتِ اہلِ سنت والجماعت'' لکھا ہوا ہے، ایک صاحب حیدر آباد سے اپنے بچے کا

داخلہ کروانے کے لیے آئے تھے، عصر سے تھوڑی دیر پہلے وہ یہاں آئے، آنے کے بعد انہوں نے وہ بورڈ (BOARD) پڑھا اور یہ سمجھا کہ شاید یہ اہلِ بدعت کی مسجد ہے؛ اب وہ بے چارے صحیح المسلک تھے، ان کو یہ بات کھٹکنے لگی، آخر انہوں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ نہیں مجھے یہاں داخلہ نہیں کرانا ہے۔ اب عصر کا وقت بالکل قریب تھا، تو وہ نماز پڑھنے کے لیے تو ٹھہر گئے، اب نماز میں یہاں جو کیفیت انہوں نے دیکھی کہ دعا بھی ہو رہی ہے تو سری ہو رہی ہے اور اہلِ بدعت کے ہاں تو جہری کیا؛ بل کہ شری ہوتی ہے یعنی اتنا شور، شغب اور اتنا ہنگامہ کہ اگر یہ سب چیزیں نہ ہوں، تو وہ سمجھتے ہیں کہ دعا ہی نہیں ہوئی، تو وہ صاحب اب نماز پڑھے، تو پھر ان کے دل میں کھٹک پیدا ہوگئی کہ بورڈ تو ہے اہلِ سنت (اہلِ بدعت) کا؛ لیکن اندر گیا تو واقعی سنت ہے، تو پھر انہوں نے کسی سے پوچھا، میرے بارے میں بھی معلومات کی، پھر جب ان کو ان کی تحقیق سے اطمینان ہوا، تو وہ اس کے بعد میرے پاس آئے۔ خیر! انہوں نے آکر داخلہ کروا دیا اور پھر خود اپنی زبان سے اپنا یہ قصہ پورا بیان کیا۔

بتانا یہ ہے کہ ہمارے ذہنوں میں اور اسی طرح عوام الناس کے ذہنوں میں بھی یہی ہے کہ اہلِ سنت وہ ہیں، جو بدعت کا کام کرتے ہیں، جیسے میں نے اُجالے اور اندھیرے کا فرق نہ سمجھے ہوئے آدمی کی مثال دی تھی۔ اسی طرح یہ بھی ہے کہ بدعت کو سنت باور کرایا گیا اور اس کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا، صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب کیا، ائمہ کی طرف منسوب کیا، کتابوں کی طرف منسوب کیا اور لوگوں کے درمیان میں یہ بات پھیلا دی گئی۔ یہ بات کیوں ہوتی ہے؟ جہالت کی وجہ سے ہوتی ہے، جب آدمی علمِ دین سے خالی ہوتا ہے اور حق و باطل کی تمیز نہیں ہوتی، سنت اور بدعت کا فرق نہیں ہوتا اور حقائق کو نہیں جانتا، تو جو اس کو پٹی پڑائی جاتی ہے، وہ اسی کو مان لیتا ہے، اگر اس کے اندر بنیادی طور پر اتنا علم ہوتا کہ

جس سے وہ اچھے اور بُرے میں فرق کرسکتا، تو ایسے آدمی کو کوئی دھوکہ نہیں دے سکتا۔

علمِ دین حاصل کریں

اسی لیے دینِ اسلام نے اتنا علم ہر آدمی پر فرض کردیا جس سے کہ وہ اچھے اور بُرے کی پہچان کرسکے۔ اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

"طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَةٌ عَلیٰ کُلِّ مُسْلِمٍ" (ہر مسلمان پر علمِ دین کا طلب کرنا فرض ہے) [سنن ابن ماجه: ۲۲۴]

آدمی کے پاس جب شریعت کا علم نہیں ہوتا، تو اچھے اور برے کا، اور سنت و بدعت کا اور حق وغلط کا فرق اس کے سامنے نہیں ہوتا، اس وجہ سے وہ حق کو قبول نہیں کرتا اور کچھ لوگ اس کے سامنے بدعت کو سنت اور سنت کو بدعت کہہ کر اس کے سامنے حق کو چھپا دیتے ہیں، تو وہ اسی بدعت کو حق سمجھ بیٹھتا ہے۔

اب کوئی اہلِ حق عالم ایسے جاہلوں کے سامنے کہے کہ بھائی! یہ کیا بدعت کا کام کر رہے ہو؟ تو وہ فوراً اس کی مخالفت پر اتر آتے ہیں، لڑنے، مرنے، قتل، قتال سب کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ کیوں؟ ان کے نزدیک اسی بدعت کا نام دراصل سنت ہے، وہ مجبور ہیں بے چارے، قصور ان کا صرف یہ ہے کہ انہوں نے دین کا علم حاصل کیوں نہیں کیا؟ اور اصل قصور تو ان کا ہے، جنہوں نے حق کو باطل اور بری چیز کو اچھا کہہ کر ان کے دماغوں میں یہ بات اتار دی۔

الغرض! پہلی وجہ حق کو قبول نہ کرنے کی، صحیح علم کا نہ ہونا ہے؛ لہٰذا یہاں جتنے میرے بھائی بیٹھے ہیں، ان سے بالخصوص میں کہوں گا کہ یہاں آنے کا آپ کو اتنا فائدہ تو ضرور ہونا چاہیے کہ آپ میں سے کوئی علمِ دین سے خالی نہ ہو، ورنہ یہاں آئے اور چلے گئے، جیسے تھے ویسے ہی رہ گئے تو فائدہ کیا ہوا؟ اگر آپ کو کوئی بہکانے

والا بہکا دے (نعوذ باللہ) تو پھر آپ بھی بہک سکتے ہیں، اس لیے کہ اچھے اور بُرے کی تمیز آدمی جب تک نہیں سیکھتا، اس وقت تک کوئی اطمینان اس پر نہیں کیا جا سکتا۔

کتنے ہمارے ایسے لوگ ہیں؟ مثلاً تبلیغی جماعت میں آ رہے ہیں، جا رہے ہیں، اب کوئی ایک غیر مقلد مل گیا اور اس نے بہکا دیا، تو وہ نکل کر چلے گئے، چلے کا ادب نہیں، جماعت کا ادب نہیں اور اب تک جو سکھایا، سمجھایا بتایا اس کا کچھ نہیں، سب ایک طرف ڈال کر غیر مقلد کے پیچھے چلا گیا، کیوں؟ اس لیے کہ انھوں نے پورے طریقے سے، اچھے طریقے سے علما کے پاس جا کر یہ نہیں سیکھا کہ حق و باطل کسے کہتے ہیں، اگر وہ سیکھ لیتے، تو ان کو کوئی بہکانے والا بہکا نہیں سکتا تھا؛ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ لوگ کھلی آنکھوں بھٹکتے چلے جا رہے ہیں۔

اس لیے علم کے لیے مجاہدہ کریں اور علما کی خدمت میں جایا کریں اور کچھ کتابیں پڑھا کریں، عقائد کیا ہوتے ہیں، سنت کیا ہوتی ہے، بدعت کیا ہوتی ہے، اسی طریقہ پر حق و باطل کی پہچان کے لیے جو جو ضروری مواد ہے، وہ سارا مواد پڑھیں؛ تا کہ ان کو معلوم ہو جائے کہ اچھا کیا ہے اور بُرا کیا ہے۔

حق قبول نہ کرنے کی دوسری وجہ: تکبر

دوسری وجہ (جس کی وجہ سے آدمی عام طور پر حق کو قبول نہیں کرتا وہ) ہے تکبر، علم تو ہے اس کے پاس، حقائق سے وہ نا آشنا نہیں؛ لیکن تکبر آ گیا، جس کی وجہ سے بھی آدمی حق کو روند دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میرے اس کو قبول کر لینے کی وجہ سے میری ناک نیچی ہو جائے گی۔

آپ تاریخ کا مطالعہ کریں، تو آپ کو ایسے بہت سے لوگ ملیں گے جو جاننے کے باوجود اپنی اَنا کی وجہ سے مانتے نہیں تھے، ان کے تکبر نے ان کو مجبور کیا کہ وہ حق

کو ٹھکرادیں۔

شیطان نے سجدے سے کیوں انکار کیا؟

اس کی سب سے بڑی مثال تو قرآن نے ہم کو دے دی اور وہ ہے شیطان کا قصہ کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو حکم دیا کہ وہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرے ؛مگر شیطان نے تکبر کی وجہ سے سجدہ کرنے سے انکار کردیا۔

آدمی کے اندر جب عشق ہوتا ہے تو تکبر ٹوٹ جاتا ہے، وہ عاجز ہوجاتا ہے اور وہ قبول کرنے کے لیے ہر وقت آمادہ رہتا ہے ۔شیطان کے اندر اللہ کا عشق ہی موجود نہیں تھا، علم موجود تھا اور عبادت بھی بہت تھی، ریاضات اور مجاہدات تو اس نے بہت کیے تھے اور عرفان و معرفتِ حق بھی اسکو حاصل تھی؛ لیکن اس کے باوجود تکبر کرتے ہوئے اس نے اللہ کے اس حکم کو ٹھکرادیا۔قرآن اس کے بارے میں کہتا ہے ﴿اَبیٰ وَاسْتَکْبَرَ﴾ (انکار کیا اور تکبر جتایا)۔دیکھئے! صاف اللہ نے فرمایا کہ اس نے تکبر کیا اور آدم علیہ السلام کے سامنے اس نے بڑائی جتائی۔معلوم ہوا کہ یہ تکبر وہ چیز ہے جس کی وجہ سے انسان حق سے دور ہوجاتا ہے اور حق کو قبول کرنے سے انکار کردیتا ہے۔

ابوجہل اور تکبر

آپ کو معلوم ہوگا، سیرت کی کتابوں میں آتا ہے کہ اَخنَس بن شُرَیق رضی اللہ عنہ نے ابوجہل سے کہا کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا سمجھتے ہو؟ کیا یہ سمجھتے ہو کہ وہ جھوٹے ہیں یا یہ سمجھتے ہو کہ وہ غلط ہیں؟ اس نے کہا کہ نہیں نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ وہ اللہ کے نبی ہیں؛ لیکن بات یہ ہے کہ ہم اور بنوعبدِ مناف کے خاندانوں

میں پہلے سے شرف ووجاہت کے سلسلے میں مقابلہ وجھگڑا چلا آرہا تھا، جب وہ کسی سلسلے میں آگے بڑھتے ،تو ہمارا قبیلہ بھی آگے بڑھتا، انھوں نے لوگوں کو کھانا کھلایا،تو ہم نے بھی کھلایا، اور انھوں نے لوگوں کو سواریاں دیں،تو ہم نے بھی دی، انھوں نے لوگوں کو مال دیا،تو ہم نے بھی نوازا، یہ مسابقت ان میں اور ہم میں چلتی رہی اور ہم اور وہ برابر رہے؛لیکن اچانک ایسا ہوا کہ بنوعبدِ مناف نے کہہ دیا کہ ہم میں اللہ کا نبی ہے،جس پر آسمان سے وحی آتی ہے،تو اب ہم کہاں سے نبی لائیں؟ اس لیے بس اب اتنا ہی ہوسکتا ہے کہ ہم ان کو نبی ہی نہ مانیں؛اس لیے میں نہیں مانتا ہوں۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اور ابوجہل ایک گلی سے جارہے تھے کہ ہماری ملاقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوگئی ،آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجہل سے فرمایا کہ ابوالحکم! اللہ و رسول کی جانب آجاؤ، ابوجہل کہنے لگا کہ اے محمد! کیا تم ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہنے سے باز نہ آؤ گے، جو تم کہتے ہو اگر اس کو میں سچ سمجھتا تو ضرور مان لیتا۔اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے،تو ابوجہل مجھ سے کہنے لگا کہ میں جانتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں؛مگر قصی کی اولاد میں سے ہیں،قصی کے خاندان والوں نے کہا کہ ہم کو غلافِ کعبہ چڑھانے کا شرف حاصل ہے،ہم مشورے کا نظم کیا کرتے ہیں، جھنڈے اٹھانے ، حاجیوں کو پانی پلانے کی ذمہ داری ہماری ہے، ہم نے کہا کہ ہاں! یہ سب ہے۔ پھر انھوں نے کہا کہ ہم میں نبی بھی ہے؛مگر خدا کی قسم ہم کبھی اس کو نہیں مانیں گے۔

(دلائل النبوة: ۲/۲۰۶، سیرت ابن اسحاق: ۴/۱۷۰، الخصائص الکبریٰ: ۱/۱۹۰، الروض الأنف: ۲/۸۱)

دیکھا آپ نے؟ حق کو سمجھ رہا ہے اور اقرار بھی کر رہا ہے کہ ہاں! میں اللہ کا پیغمبران کو سمجھتا ہوں؛ لیکن مانتا اس لیے نہیں ہے کہ اپنی ناک نیچی ہو جائے گی۔

ابو طالب اور حق کا انکار

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب نے بھی حق کا انکار اسی ''انا'' کی وجہ سے کیا تھا۔ حدیث میں قصہ آتا ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے انتقال کے وقت ان کے قریب گئے، لوگ بیٹھے ہوئے تھے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے کان میں ان سے کہا کہ چچا جان! میں آپ سے یہ کہنے کے لیے آیا ہوں کہ آپ کا یہ آخری وقت ہے اور اگر اس وقت بھی آپ کلمۂ طیبہ ''**لا الٰہ إلا اللّٰہ محمد رسول للّٰہ**'' کا اقرار کرلیں اور اس کی شہادت دے دیں اور میرے کان میں بھی کلمہ پڑھ لیں تو انشاء اللہ آپ کی نجات ہو جائے گی۔

وہ تھوڑی دیر سوچنے لگے، پھر اس کے بعد کہا کہ بھتیجے! میں جانتا ہوں کہ تم سچے ہو؛ لیکن میں اگر تمہارے اوپر ایمان لایا، تو قریش کی بوڑھی عورتیں کہیں گی کہ اتنا بڑا آدمی ہو کر اپنے بھتیجے پر ایمان لے آیا؟ (وہ تو قریش کے سرداروں میں سے تھے) یہ طعنہ میں نہیں سن سکتا؛ اس لیے میں قبول نہیں کرتا۔

دیکھیے! ابو طالب کو بھی اسی بات نے روک لیا تھا اور حق کو قبول کرنے کے لیے وہ آمادہ نہیں ہوئے۔

اس طرح کی بے شمار مثالیں ہیں، جن سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حق کو نہ ماننے کی بہت بڑی وجہ یہی بڑائی، تکبر اور غرور ہے، جس کی وجہ سے دنیا میں بہت سے لوگ گمراہ ہوئے؛ اس لیے بڑی فکر کی ضرورت ہے، اپنے اندر اگر ایسی بیماری ہو، تو کھرچ کھرچ کر اس کو نکالنے کی ضرورت ہے، اگر ہم نے غور نہیں کیا،

بیماری ختم کرنے کا عزم نہیں کیا، تو ہمارا شمار بھی انہیں متکبرین میں ہوگا۔

حق قبول نہ کرنے کی تیسری وجہ: مفاد پرستی

تیسری وجہ جس کی وجہ سے انسان عام طور پر حق کو قبول نہیں کرتا، وہ ہے ''مفاد پرستی''، یعنی حصولِ نفع، وہ چاہتا ہے کہ مجھے نفع حاصل ہوتا رہے، اگر میں حق کو قبول کرلوں گا، تو میرا وہ نفع بند ہوجائے گا، اگر میں قبول کرلوں گا، تو میرے مفاد پر اور نفع پر زد پڑے گی، اس لیے وہ انکار کرنے لگتا ہے۔

اس کی بے شمار مثالیں پرانے زمانے میں ملیں گی، قریب زمانے میں ملیں گی، موجودہ زمانے میں بھی ملیں گی؛ آپ غور کرتے جائیں، بہت لوگ آپ کو ایسے ملیں گے، جنہوں نے اللہ کا حکم جانا، اللہ کے نبی کا حکم جانا، حق کو سمجھا اور اس کی پوری تفصیلات ان کے سامنے آگئیں؛ لیکن اس کے باوجود اس لیے قبول نہیں کیا کہ مفاد پر زَد پڑتی ہے۔

یہودیوں کا حال خود قرآن میں اللہ نے جگہ جگہ ان الفاظ کو استعمال کرکے بیان کیا ہے:

﴿اِشْتَرَوْا بِآيَاتِ اللّٰهِ ثَمَناً قَلِيْلاً﴾ (انہوں نے اللہ کی آیات کے مقابلے میں دنیا کا تھوڑا سا ثمن (مال) لے لینا پسند کیا) [التوبة:۹]

یہ لوگ حق کو قبول نہیں کرتے تھے؛ اس لیے کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر ہم نے اسلام کو قبول کرلیا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی مان لیا، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیں یہ سارے دھندے چھوڑ دینے پڑیں گے، اب آیات کو کہاں سے بیچیں گے؟ وہ توریت کی آیتیں بیچ بیچ کر اپنی زندگی گذارا کرتے تھے اور اس طریقے پر ان کا مفاد، ان کے مذہب سے وابستہ ہوگیا تھا، اب انہوں نے دیکھا کہ جس مذہب سے

ہمارا مفاد وابستہ ہو چکا ہے، ہمیں مال مل رہا ہے، پیسہ مل رہا ہے، اگر ہم اس مذہب کو چھوڑ دیں اور دوسرے مذہب کو ہم لے لیں، جو محمد رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم لے کر آئے ہیں، تو ہمارا مفاد اس سے ختم ہو جائے گا، سارا عیش ختم ہو جائے گا؛ اس لیے قبول نہیں کرتے تھے۔

آج کے پیروں میں مفاد پرستی

مفاد پرستی بہت بڑی وجہ ہے، جس سے آدمی حق کو قبول نہیں کرتا، آج بھی دنیا میں آپ کو بہت سارے ایسے ملیں گے، جو سنت اور بدعت کا فرق، اچھے اور برے کی تمیز، مسلکِ اہلِ سنت کیا ہے؟ اور مسلکِ اہلِ بدعت کیا ہے؟ یہ اچھی طرح ان کے سامنے واضح ہے؛ لیکن اس کے باوجود مفاد متعلق ہونے کی وجہ سے وہ اپنا فاتحہ، و درود، عرس وصندل اور چھٹیاں اور سوم و چہلم اور برسیاں، سماع وقوالیاں چھوڑنے کو تیار نہیں۔

یہاں اشتہارات لگتے رہتے ہیں ''فلاں حضرت کی چھُٹی''، معلوم نہیں اس سے اِن کی کب ہوگی چھُٹی، جب ان کی چھُٹی اس سے ہو جائے گی، تو یہ ساری چیزیں چھٹتی چلی جائیں گی؛ لیکن یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے، حالاں کہ ان میں سے اکثر بیشتر (عوام کو چھوڑ کر) جو جان کار لوگ ہیں اور ان کے علما ہیں یا ان کے بڑے لوگ ہیں، ان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ ساری چیزیں خرافات ہیں، دینِ اسلام سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، اس کو سنت کسی طور پر بھی ہم نہیں کہہ سکتے، اللہ کے رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے کبھی ثابت نہیں، کسی حدیث کے اندر یہ نہیں آیا، صحابہ کرام رَضِيَ اللهُ عَنْهُم نے کبھی نہیں کیا، نہ ائمۂ کرام نے کبھی کیا؛ لیکن اس کے باوجود برابر یہ کام کرتے چلے جا رہے ہیں۔

عام طور پر یہ جتنی بدعتیں پھیلی ہوئی ہیں اور پہلے سے چلی آرہی ہیں، ان میں آپ ضرور بالضرور اس بات کا مشاہدہ کریں گے کہ مفاد متعلق ہونے کی وجہ سے یہ چل رہا ہے۔

حکیم الامت رحمہ اللہ کے خطاب سے پیروں میں خوشی

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہٗ ایک علاقے میں بیان کے لیے پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ پورے کا پورا علاقہ پیروں کا ہے، وہی غلط قسم کے پیر جو صرف دنیا طلبی کے لیے وہاں بیٹھے ہوتے ہیں، آستانے بنائے ہوئے ہیں اور لوگوں میں مختلف رسومات چلاتے رہتے ہیں، بس اس کے علاوہ ان کا اور کوئی کام نہیں، وہ یہ نہیں بتاتے کہ نماز پڑھو؛ بل کہ یہ بتاتے ہیں کہ بھائی! ہم کو پیسے دے دو، ہم تمہاری نماز پڑھ لیں گے۔

اس طرح کے پیروں کا وہ علاقہ تھا اور حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ تشریف لے گئے اور وہاں حضرت کا بیان ہونا تھا، یہ خبر سن کر سارے پیروں کے کان کھڑے ہو گئے کہ پتہ نہیں آج ہمارے خلاف یہ کیا کیا بیان کر دیں گے۔ خیر! سب بہت متوجہ تھے کہ کیا بیان ہوگا اور کیسا ہوگا؟ جب حضرت نے بیان فرمایا تو بیان میں سنت کی اتباع، علمِ دین کی اہمیت، علمِ دین کی ضرورت، شریعت پر چلنے کی ترغیب وغیرہ پر مشتمل سارے مضامین بیان کیے اور کہا کہ آپ کو علمِ دین سیکھنے کے لیے علما کی خدمت میں جانا چاہیے، جب بھی آپ کو کوئی مسئلہ پیش آئے، تو مسئلہ علما سے پوچھا کریں؛ لیکن پیسے ان کو نہ دیں؛ بل کہ پیسے ان اپنے پیروں کو دے دیں، ان کے لیے تو نذرانہ اور ہمارے لیے تو بس یہی کافی ہے کہ ہم لوگ آپ کی خدمت کرتے رہیں گے۔ یہ بیان کا خلاصہ تھا، ورنہ وہ خطاب تو چار گھنٹے کا تھا۔

اب بیان ہونے کے بعد پیر صاحبوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور ان کا تبصرہ یہ تھا کہ اتنا اچھا مولوی ہم نے نہیں دیکھا، جو ہماری تائید کرتا ہو، ہم تو یہی چاہتے تھے کہ ہمارا نذرانہ ختم نہ ہو جائے۔ تو یہ مفاد پرستی دراصل انسانوں کو حق قبول کرنے سے روکتی ہے۔

ایک جھوٹے پیر کی مرید نے پٹائی کردی

ایک جگہ ایک پیر صاحب تھے، ایک صاحب ان کے مرید ہو گئے، ایک بار ان کے پیر ان کے پاس آئے، دیکھا تو پیر صاحب بہت دبلے پتلے ہو گئے ہیں، تو مرید صاحب کو بڑا رحم آیا اور کہا کہ پیر صاحب! آپ تو بہت دبلے پتلے ہو گئے ہیں، کیا بات ہے؟ کہا کہ بھائی! دبلے پتلے نہیں تو پھر کیا موٹے ہوں گے؟ ہمارے لیے تو بڑے مسئلے ہیں اور وہ مسئلے ایسے ہیں کہ ان میں سے ہر مسئلہ آدمی کو دبلا کر دے۔

مرید نے کہا کہ کیا مسئلے ہیں؟ کہا کہ دیکھو تمہاری نماز مجھے پڑھنی پڑتی ہے، تمہارے روزے مجھے رکھنے پڑتے ہیں اور تمہارا فلاں کام مجھے کرنا پڑتا ہے، میرے ایک ہزار مرید ہیں، ایک ہزار مریدوں کی نمازیں میں ادا کرتا ہوں، ایک ہزار مریدوں کے روزہ میں رکھتا ہوں، ان کی تہجد میں پڑھتا ہوں، ان کا ذکر میں کرتا ہوں، ان کا وظیفہ میں پڑھتا ہوں۔ مرید نے کہا: اللہ اکبر! ہمیں تو ایک نماز پڑھنا مشکل ہوتا ہے اور آپ کو تو ایک ہزار آدمیوں کی پانچ نمازیں پڑھنا ہے، کیا حال ہوتا ہوگا؟ واقعی دبلے ہونے ہی کی بات ہے۔

پھر پیر نے کہا کہ یہی نہیں؛ بل کہ سارے مریدوں کی طرف سے آخرت میں پُل صراط پر بھی مجھے ہی چلنا ہے۔ اب اس کی فکر لگی ہوئی ہے، اس فکر سے بھی دبلا ہو گیا ہوں۔ یہ جو مرید صاحب تھے ان کو بڑا رحم آیا۔ انہوں نے کہا کہ پیر صاحب!

میرا ایک کھیت ہے، وہ کھیت میں آپ کے نام لکھ دینا چاہتا ہوں، پیر نے کہا کہ ٹھیک ہے چلو قبضہ کروادو، نیک کام میں دیر کیسی؟ دونوں چلے اور راستہ تھا کھیتوں کا، جس میں بنے ہوئے صاف راستے نہیں ہوتے، وہاں دونوں طرف کھیتوں کے درمیان چھوٹی چھوٹی مینڈھ بنی ہوئی تھیں، اس پر چل کر جانا تھا، اسی پر پیر و مرید دونوں چل رہے تھے اور ادب کی وجہ سے مرید پیر صاحب کے پیچھے چل رہا تھا، مگر پیر صاحب اس مینڈھ پر عادت نہ ہونے کی وجہ سے چل نہیں پا رہے تھے، عادت نہیں تھی ایسی جگہ چلنے کی، خیر گرتے گرتے بچتے جا رہے تھے، ایک جگہ تو بچ نہیں پائے، گر ہی گئے، گرتے ہی پیچھے جوان کا مرید تھا، اس نے ان کو ایک لات ماری اور کہا کہ آپ تو کہتے تھے کہ پل صراط پر چلنا ہے، آپ کو تو اس راستے پر بھی چلنا نہیں آتا، وہاں کیسے چلیں گے آپ؟

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ بعض جگہ ایسے پیر بیٹھے ہوئے ہیں، جن کا مقصد صرف دنیا، جن کا مقصد صرف پیسہ، جن کا مقصد صرف دنیاوی مفاد، لوگ ان کے پاس جاتے ہیں اور پھنس جاتے ہیں اور یہ لوگ مفاد پرستی کی وجہ سے یہ مکاریاں، چالبازیاں، جھوٹ، دھوکہ چھوڑنا نہیں چاہتے، حق کی طرف آنا نہیں چاہتے۔

ایک جھوٹے پیر کو پیٹ کی فکر

حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے ایک جگہ اپنا واقعہ لکھا ہے کہ حضرت کے ایک بہت ہی مخالف آدمی تھے، جو حضرت کو کافر تک کہتے تھے، مخالفت پر تلے ہوئے تھے؛ لیکن ان کے گھر میں ''بہشتی زیور'' پڑھنے کا معمول تھا، حضرت نے لکھا ہے کہ میرے ایک دوست کی ان سے دوستی تھی، انہوں نے ان سے پوچھا کہ آپ تو مولانا تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ کی مخالفت کرتے رہتے ہیں؛ لیکن آپ کے گھر میں بہشتی زیور ہے اور

عورتیں پڑھتی رہتی ہیں اور آپ نے اس کی اجازت بھی دے رکھی ہے، کیا قصہ ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ بھائی! بات دراصل یہ ہے کہ حق وہی ہے جو اس میں لکھا ہوا ہے؛ اس لیے میں گھر میں اس کو پڑھتا ہوں، پڑھاتا ہوں، تو انہوں نے کہا کہ پھر آپ بیانات کے اندر مخالفت کیوں کرتے ہیں اور کھلم کھلا انہیں کافر کیوں کہتے ہیں؟ تو پیر نے پیٹ دکھا کر کہا کہ بھائی! مسئلہ پیٹ کا ہے۔

یہ واقعہ حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللہُ نے خود بیان کیا ہے، اپنے مواعظ کے اندر۔ تو دیکھیے! مفاد پرستی سے انسان حق کو قبول کرنے سے دور ہو جاتا ہے۔

حق قبول نہ کرنے کی چوتھی وجہ: تعصب

حق قبول نہ کرنے کی چوتھی وجہ ہے تعصب، یہ تعصب دراصل زمانۂ جاہلیت کی پیداوار ہے، زمانۂ جاہلیت کے لوگوں میں تعصب تھا، تعصب کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اپنوں کی تائید کرنا، دوسروں کی مخالفت کرنا، اس بات سے قطعِ نظر کہ حق کدھر ہے اور باطل کدھر ہے؟ یہ تعریف ہے تعصب کی۔

زمانۂ جاہلیت میں بڑی بڑی جنگیں ہو جاتی تھیں، لڑائیاں چلتی رہتی تھیں، قبیلوں میں، خاندانوں میں اور مختلف قسم کے لوگوں کے درمیان جھگڑے چلتے تھے اور یہ جھگڑے جو چلتے تھے عام طور پر تعصب اس کی بنیاد ہوتی تھی۔

آج بھی یہ تعصب بڑے پیمانے پر پایا جاتا ہے، لوگ یہ دیکھنے کے بجائے کہ حق کدھر ہے، باطل کدھر ہے؟ یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارا آدمی بول رہا ہے یا دوسرا بول رہا ہے، اپنوں کا اور غیروں کا فرق، اپنی جماعت اور دوسری جماعت کا فرق، اپنے مدرسے اور غیر کے مدرسے کا فرق، اپنے پاس رہنے والوں اور دوسروں کے پاس رہنے والوں کا فرق، ہمارے ادارے کا فارغ ہو، تو الگ معاملہ دوسرے ادارے کا

فارغ ہو، تو الگ معاملہ۔ یہ جو فرق کرنے کی بیماری پیدا ہوگئی ہے، اس میں حق کو، باطل کو، اچھے اور بُرے کو دیکھے بغیر اپنے اور غیر میں فرق کرنا یہی دراصل تعصب ہے، جس کی شریعت بالکل بھی اجازت نہیں دیتی۔

بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی ظاہر میں معمولی قسم کا ہوتا ہے؛ لیکن در حقیقت بہت بڑا آدمی ہوتا ہے، مثلاً عالم و فاضل ہوتا ہے؛ مگر لوگ اس لیے اس کی بات کو ٹھکرا دیتے ہیں کہ یہ دیکھنے میں معمولی لگ رہا ہے۔ بھائی! حق کو دیکھو، حق آ رہا ہو، معمولی آدمی کے پاس سے آ رہا ہے یا بڑے آدمی کے پاس سے آ رہا ہے، یہ نہیں دیکھنا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ حق کیا ہے؟ اور حق کس کے ساتھ ہے؟

خود اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَلْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ فَحَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا" (اچھی بات، حق بات مؤمن کا گم کردہ خزانہ ہے، جہاں سے بھی وہ اس کو ملے وہ اس کو لینے کا زیادہ حق دار ہے۔

(سنن الترمذي: ۲۶۸۷)

زمانۂ جاہلیت میں تعصب کی بنیاد پر جنگ

اسی حق و ناحق سے آنکھیں بند کر لینے کی وجہ سے زمانۂ جاہلیت میں بڑی بڑی جنگیں بعض معمولی معمولی باتوں پر ہوتی تھیں۔

ایک واقعہ کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ "بازارِ عکاظ" (اس زمانے میں سال میں دو دفعہ لگتا تھا اور اس میں تماشے، گانا بجانا سب ہوتا تھا، اسے آج کل کی زبان میں سمجھ لیجیے کہ جیسے (EXIBITION) ہوتا تھا۔ ایک دفعہ "بنوغفار" کا ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا، بیٹھے بیٹھے اپنے پیر لمبے کر دیا اور کہنے لگا کہ میں عرب میں سب سے بڑا ہوں، کوئی مائی کا لال ہے، جو میرے پیر کو تلوار سے مار سکتا ہے؟ اب قریب میں ایک

آدمی بنی قشیر کا بیٹھا ہوا تھا اور اس نے اٹھ کر اس کے پیر کو ہٹا دیا اور کہنے لگا: میں ہوں مائی کا لال؛ بس اتنی چھوٹی سی بات تھی، وہ ایک خاندان کا تھا اور یہ ایک دوسرے قبیلے و خاندان کا تھا، بس اتنی بات پر دونوں میں جھگڑا شروع ہوا، اس نے اپنے لوگوں کو بلایا اور اُس نے اپنے لوگوں کو آواز دی، بس تھوڑی دیر کے اندر اس کے قبیلے والے اِدھر اور اُس کے قبیلے والے اُدھر جمع ہو گئے، اب کوئی یہ نہیں پوچھ رہا ہے کہ بھائی معاملہ کیا ہے؟ بس آئے اور جنگ شروع ہو گئی، بنیاد یہ ہے کہ یہ ہمارا آدمی ہے اور وہ تمہارا آدمی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ یہ جنگ شروع ہوئی تھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا میں آنے سے پچاس برس پہلے اور ختم ہوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے بعد۔ اب اندازہ کیجیے ان کی جہالت کا، ان کے تعصّبات کا، حق کیا ہے، باطل کیا ہے؟ صحیح کیا ہے غلط کیا ہے؟ کیا ہوا تھا اور کیوں جھگڑا شروع ہوا تھا؟ کوئی بحث اس پر نہیں ہے، بس بحث یہ ہے کہ یہ میرا آدمی اور یہ تیرا آدمی۔ اس کو کہتے ہیں تعصب اور تعصب کی وجہ سے بھی عام طور پر انسان حق کو قبول نہیں کرتا۔

مثال کے طور پر ایک آدمی حق بول رہا ہے؛ لیکن اس کو کچھ لوگ سمجھ رہے ہیں کہ یہ اپنا آدمی نہیں ہے؛ اس لیے اس کی قبول نہیں کریں گے، دوسرا آدمی غلطی پر ہے، بدعت کر رہا ہے، الٹا سیدھا کر رہا ہے، باطل پر جا رہا ہے؛ لیکن تائید اس لیے کر رہے ہیں کہ یہ ہمارا آدمی ہے (لا حول و لا قوۃ إلا باللہ)

اسلام نے اس قسم کے تعصّبات کو مٹانا چاہا اور اسلام آیا ہی اس لیے کہ اس قسم کی ساری خرافات کو مٹائے؛ لیکن اس کے بجائے آج مسلمانوں میں یہ ساری چیزیں پیدا ہو گئیں ہیں۔

ہمارے اکابر کے حالات کا مطالعہ کریں، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ حق کو قبول کرنے میں پس و پیش نہیں ہوتے تھے، فوراً قبول کرتے تھے، ان میں یہ بیماریاں نہیں تھیں۔

حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللہُ نے حق کو قبول کیا

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رَحِمَہُ اللہُ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ مسجد میں تشریف فرما تھے کہ کسی ضرورت سے پیسوں کی ریز گاری کی ضرورت پڑی، تو حضرت ایک صاحب سے مسجد ہی میں پوچھنے لگے کہ آپ کے پاس ان روپیوں کے کھلے پیسے ہیں؟ جب حضرت نے یہ کہا، تو قریب میں ایک طالب علم بیٹھے ہوئے تھے، وہ وہاں سے فوراً حضرت کے پاس آئے اور کہنے لگے حضرت! ایک ضروری مسئلہ پوچھنا ہے، حضرت نے کہا: پوچھو، کہا کہ مسئلہ یہ ہے کہ کیا ریز گاری کا معاملہ بیع میں داخل ہے؟ یعنی اس کو شرعاً بیع کہتے ہیں یا نہیں؟ حضرت نے فرمایا: ہاں داخل ہے، پھر حضرت فوراً سمجھ گئے کہ یہ طالب علم مجھے تنبیہ کرنے کے لیے یہ مسئلہ معلوم کررہے ہیں، حضرت نے کہا: ''اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے''۔

بات یہ ہے کہ مسجد میں بیع جائز نہیں ہے اور ریز گاری بھی ایک لین دین کا معاملہ ہونے کی وجہ سے بیع میں داخل ہے اور حضرت بھول کر یہ معاملہ مسجد میں کرنے جارہے تھے، اس لیے اس طالب علم نے ایک انوکھے انداز سے یاددہانی کردی۔

کیا بزرگانِ دین تھے! کیا ان کا دل تھا! کیا ان کی تواضع تھی اور کیا ان کا اخلاص تھا؟!! اتنے بڑے آدمی ''حکیم الامت، مجدد الملت'' جن کی شہرت چہار دانگِ عالم، جن کی کتابیں ہر ہر گھر میں پہنچی ہوئیں تھیں، جن کا فیض آج تک دنیا کے اندر جاری ہے، کوئی عالم ایسا نہیں جو ان کی کتابوں سے فیض حاصل نہ کرتا ہو؛ لیکن ایک طالبِ

علم ٹوک رہا ہے اور حضرت قبول کرر ہے ہیں۔ یہ ہوتی ہے حقانیت، یہ ہوتی ہے للّٰہیت، یہ ہے اخلاص اور یہ تواضع کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور جس کے اندر تکبر کا مرض ہو، وہ حق کو کبھی قبول نہیں کرتا۔

اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: تکبر دراصل ''بَطَرُ الْحَقّ'' (یعنی حق کو ٹھکرانے) کا نام ہے۔

(ترمذي: ۱۹۹۹)

یعنی حق کو ٹھکرانا، حق کو جھٹلانا، اسی کا نام دراصل تکبر ہے، تکبر یہ نہیں کہ آدمی اچھے کپڑے پہنے، تکبر یہ نہیں کہ آدمی اچھے گھر میں رہے، اچھی چیزیں استعمال کرے اور مزے مزے کی غذائیں کھایا کریں، یہ تکبر نہیں ہے؛ بل کہ یہ تجمل ہے یعنی جمال حاصل کرنا؛ کوئی مضائقہ نہیں بہ شرطے کہ اس میں اسراف نہ ہو، بناوٹ نہ ہو؛ اللہ کی نعمت کو سمجھ کر صحیح طور پر استعمال کریں۔

آیئے حق کی طرف

آپ کے سامنے حق کو ٹھکرانے اور قبول نہ کرنے کی چار وجوہات میں نے بیان کیں، جہالت: یہ بھی موجود ہے مسلمانوں میں، تعصب: یہ بھی موجود ہے مسلمانوں میں، تکبر: یہ بھی موجود ہے مسلمانوں میں اور مفاد پرستی: یہ بھی موجود ہے مسلمانوں میں۔

کچھ لوگ ایسے ہیں، جو ان وجوہات کی وجہ سے حق کو قبول نہیں کرتے۔ آپ دیکھیں گے، تو معاشرے کے اندر ایک بہت بڑی جماعت ایسی ملے گی، جو حق کو قبول کرنے کی صلاحیت سے دور ہو چکی ہے، سنتوں کے نعرے لگائے جا رہے ہیں؛ لیکن کتنے لوگ ہیں؟ جو قبول کرر ہے ہیں، حق کی آواز اٹھائی جا رہی ہے؛ لیکن کتنے

لوگ ہیں، جو اس کو قبول کر رہے ہیں؟ نیکی کی دعوت پیش کی جارہی ہے؛ لیکن کتنے لوگ ہیں، جو قبول کر رہے ہیں؟ بھائیو! بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے اندر یہ بیماریاں گھس گئی ہیں۔

اب ان بیماریوں کو نکالنے کی کوشش کریں، بالخصوص دو چیزیں تعصب اور تکبر یہ دو بڑے خطرناک ہیں؛ گرچہ جہالت اور مفاد پرستی بھی غلط ہی ہے؛ لیکن اس کا علاج ذرا آسان ہے ، جہالت کا علاج اس لیے آسان ہے کہ ذرا پڑھادیں گے ، بتادیں گے ، سمجھادیں گے ، حقائق سامنے پیش کردیں گے، تو جہالت کی بیماری ختم ہوجائے گی۔ مفاد پرستی کا حال بھی ایسا ہے کہ فکرِ آخرت وغیرہ سے آدمی کچھ سمجھ جاتا ہے؛ لیکن تعصب اور تکبر ایسی بیماریاں ہیں کہ ان کی جڑیں بڑی گہری ہوتی ہیں ، بہت اندر تک پہنچی ہوئی ہوتی ہیں، آدمی تعصب اور تکبر کی بنیاد پر حق کو قبول کرنے سے برابر انکار کرتا چلا جاتا ہے۔

لہٰذا ہم یہ عہد کریں کہ جب بھی حق بات کہی جائے گی ہم قبول کریں گے، اپنی بیماریوں کی اصلاح کریں گے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔
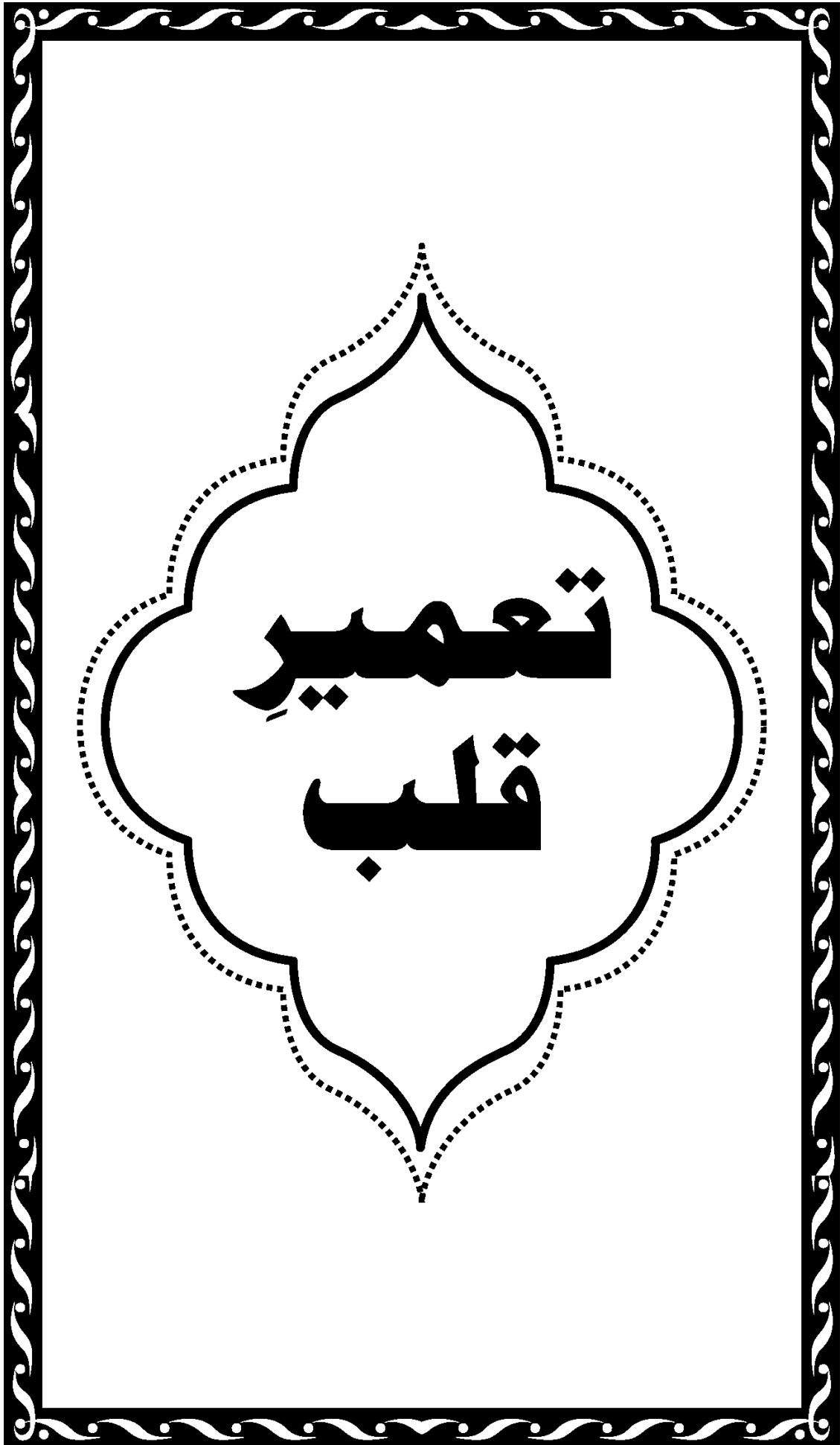
تعمیرِ
قلب

باسمہٖ تعالیٰ

تعمیرِ قلب

فضیلت-ضرورت-اہمیت

الحمد للّٰہ و کفیٰ و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ أما بعد:

﴿قَالَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم أَ لَا! إِنَّ فِيْ الْجَسَدِ لَمُضْغَةً إِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَ لَا وَهِيَ الْقَلْبُ﴾

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گوشِ ہوش سے سن لو! بلاشبہ جسم میں ایک لوتھڑا ہے، جب وہ درست ہوتا ہے، تو سارا جسم درست رہتا ہے اور جب وہ فاسد ہو جاتا ہے، تو سارا بدن فاسد ہو جاتا ہے اور سن لو! وہ دل ہے)

(بخاري: ۱/۱۳، مسلم: ۲/۸۲)

حقیقتِ قلب

محترم بھائیو! حدیث سمجھنے سے پہلے قلب کی حقیقت کا جان لینا ضروری ہے۔ لفظِ قلب کا اطلاق دو معنی پر ہوتا ہے۔ ایک تو اس لحمِ صنوبری پر جو سینے کے بائیں جانب ہے اور اس کے اندرون میں ایک خانہ ہوتا ہے، جس میں سیاہ خون بھرا ہوا ہوتا ہے، یہی منبعِ روح ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ گوشت کا لوتھڑا انسان کے ساتھ خاص نہیں؛ بل کہ دیگر حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے، جس کی کوئی خاص فضیلت و اہمیت نہیں ہو سکتی۔

قلب کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ ایک لطیفۂ ربانی وروحانی ہے، جو حقائق و معارف کا ادراک کرتا ہے اور ایسی اشیا کا مشاہدہ کر لیتا ہے، جن کو خیال و وہم حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی معنیٰ کر قرآن کی اس آیت میں قلب سے مراد ہے:

﴿إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ﴾ [ق:۳۷]

(اس میں اس شخص کے لیے نصیحت ہے، جو قلب (دل) رکھتا ہے)

اس آیت میں وہ صنوبری شکل مراد نہیں ہو سکتی؛ کیوں کہ یہ گوشت کا لوتھڑا تو ہر انسان؛ بل کہ ہر حیوان کے پاس ہے، تو پھر " لمن كان له قلب" کی قید کیسے ہو سکتی ہے؟ پس یہ قیدِ احترازی اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں، جو قلب (دل) نہیں رکھتے اور ان کو دلائلِ واضحہ و آیاتِ بینہ سے نصیحت حاصل نہیں ہوتی، پس یہاں قلب سے دوسرے معنی مراد ہیں۔

علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ تفسیرِ "روح المعانی" میں رقم طراز ہیں:

"و هو في الأصل مصدر سمي به الجسم الصنوبري في التجويف الأيسر من الصدر وهو مشرق اللطيفة الإنسانية ويطلق علىٰ نفس اللطيفة النورانية الربانية العالمة التي هي مهبط الأنوار الإلٰهية الصمدانية و بها يكون الإنسان إنساناً وبها يستعد لاكتساب الأوامر واجتناب الزواجر الخ". (روح المعاني: ۱/۱۳۴)

(اور وہ قلب اصل میں مصدر ہے، جس سے جسم صنوبری کو موسوم کیا گیا ہے، جو سینے کے بائیں ضوف میں رکھا گیا ہے اور یہ لطیفۂ انسانی کو روشن کرنے والا ہے اور (قلب) خود اس لطیفۂ نورانیہ ربانیہ پر بھی بولا جاتا ہے، جو انوارِ الٰہیہ کا مہبط ہے، اسی لطیفۂ نورانی سے انسان انسان بنتا ہے اور اسی کی مدد سے انسان اللہ کے دیئے ہوئے

حکموں (اوامر) کو بجالانے اور اس کی منع کردہ چیزوں (نواہی) سے بچنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔)

اسی دوسرے معنے کے اعتبار سے قلب کو معرفتِ حق کا منبع ومحل اور اسرار وحِکَم کا مخزن ومعدن کہا جاتا ہے۔ یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ قلب کوئی محسوس شئ نہیں، جس کو مخزنِ حقائق ومعدنِ دقائق قرار دیا جائے؛ بل کہ وہ ایک معنوی حقیقت ہے، جس کا حاسۂ بصر سے ادراک نہیں ہوسکتا۔

حدیث میں قلب کا مصداق

اس حدیثِ پاک میں مضغۂ لحم وشکلِ صنوبری پر قلب کا اطلاق کرنے کے ساتھ ساتھ اس کو جسم کے صلاح وفساد کا مدار قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے جسمانی صلاح وفساد مراد نہیں؛ بل کہ معنوی صلاح وفساد مراد ہے۔ اولاً تو اس لیے کہ حضرت شارع علیہ السلام کا منصب جسمانیات سے بحث کرنا نہیں ہے۔ ثانیاً اس لیے کہ یہ بات مشاہدے کے خلاف ہے کہ صلاحِ قلب یا فسادِ قلب، صلاحِ جسم وفسادِ جسم کا باعث ہے؛ کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ دل کی بیماری سے محفوظ ہیں؛ مگر دوسرے امراضِ جسمانی میں مبتلا ہیں اور ایسے ہی کتنے مریضِ قلب ہیں، جو دوسرے امراضِ جسمانی سے محفوظ ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ صلاح وفساد سے معنوی صلاح وفساد مراد ہے نہ کہ جسمانی؛ مگر سوال یہ ہے کہ آپ نے صلاح وفسادِ معنوی کو اس صنوبری شکل اور مضغۂ لحم کے صلاح وفساد پر کیوں کر مرتب فرمایا، جب کہ یہ بھی خلافِ واقعہ ہے؟ تو اس کا جواب ہماری اوپر کی تقریر سے واضح ہوگیا کہ چوں کہ قلب بمعنی لطیفۂ ربانی میں اور قلب

بمعنی مضغۂ لحم میں ایک مناسبت اور تعلقِ خفی ہے؛ اس لیے آپ نے ایک کا اطلاق دوسرے پر فرمادیا ہے۔اب رہا یہ کہ تعلق کس نوعیت و کیفیت کا ہے؟ تو اس کے ادراک سے ہم عاجز ہیں، جیسے روح و جسم کا تعلق کہ اس کی نوعیت بھی عام عقول و اذہان کے حیطۂ ادراک سے باہر ہے، حالاں کہ اس تعلق کا انکار ممکن نہیں بس ایسے ہی یہاں سمجھ لیا جاوے۔البتہ بعض حضرات کو اس تعلق کی نوعیت و کیفیت کا بطورِ کشف والہام ادراک ہوجاتا ہے؛ لیکن یہ حضرات بھی دوسروں کو یہ نوعیت سمجھانے سے قاصر رہتے ہیں؛ کیوں کہ یہ محض ایک وِجدانی چیز ہے، جو الفاظ کی تعبیر میں سما نہیں سکتی اور الفاظ میں اتنی وسعت نہیں کہ وہ اس کو اپنے اندر سمو سکے۔

انسان شکل وصورت سے نہیں بنتا

محترم حضرات! دنیا کے انسانوں میں آپ غور کریں، تو آپ کو دو طرح کے انسان ملیں گے، ایک وہ جو صرف ظاہراً انسان کہلا سکتے ہیں ، یہ وہ لوگ ہیں، جو دنیا میں صورت کے اعتبار سے ،شکل کے اعتبار سے، ڈیل ڈول کے اعتبار سے، ظاہر کے اعتبار سے، آپ کو انسان نظر آئیں گے ،مثلاً ان کے ناک کان ایسے ہی ہوں گے ، جیسے عام انسانوں کے ہوا کرتے ہیں، اسی طرح ان کے اعضائے جسم ایسے ہی ہوں گے جیسے اور لوگوں کے ہوتے ہیں، سب کچھ انسانوں کی طرح؛ لیکن دل ان کا انسانوں جیسا نہیں ہوتا، ان کا دل تو ایک شیر اور بھیڑیئے کی طرح ہوتا ہے، کسی خون خوار درندے کا ہوتا ہے، جس کی وجہ سے ان کی صفات بھی درندوں جیسی ہوتی ہیں۔ظلم کرنا، زبردستی کرنا، مارتوڑ کرنا، قتل وغارت گری کرنا، وغیرہ۔یہی ان کا مشغلہ اور پیشہ ہوتا ہے۔

ابھی ایک خبر آپ نے اخباروں میں پڑھی ہوگی کہ ایک لڑکی کو اس کے شوہر اور

اس کے خاندان والوں نے جلا کر خاکس تر کردیا۔ کیا یہ ان کے اندر خون خوار مادہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہوا؟ کیا یہ درندہ پن نہیں ہے؟ آپ ان کو جا کر دیکھیے کہ ان کی آنکھ، ان کا چہرہ آپ ہی کی طرح ہے، ان کی چال ڈھال اور اسی طرح ان کا رہن سہن آپ ہی کی طرح ہے؛ لیکن اندر کی جو چیز ہے، وہ انسانوں جیسی نہیں ہے؛ بل کہ وہ ریچھ اور باگھ کی طرح ہے۔

تو یہ انسان باوجود اس کے کہ اس میں انسانی اعضا بہ وجہ اتم موجود ہیں؛ لیکن اگر اس کا دل بنا ہوا نہ ہو تو یہ نامکمل انسان ہے، اصل انسان صورت وشکل کا نہیں ہوا کرتا؛ بل کہ اصل انسان جسے کہتے ہیں، وہ دل کے بننے سے بنتا ہے، ظاہراً تو اسے انسان کہیں گے؛ لیکن باطناً اسے انسان نہیں کہا جاتا، جیسے ابو جہل ظاہر کے اعتبار سے انسان تھا؛ لیکن حقیقت کے اعتبار سے شیطان تھا، فرعون ظاہراً تو انسان تھا؛ لیکن دل کے اعتبار سے وہ شیطان سے بھی بدتر تھا۔

دوسری طرف ایسے لوگ بھی آپ کو نظر آئیں گے، جن کا ظاہر بھی انسانوں کی طرح ہوتا ہے اور باطن یعنی دل بھی کامل انسانوں جیسا ہوتا ہے۔ ان کا دل عشقِ خداوندی سے لبریز ہوتا ہے، دولتِ معرفت سے سرشار ہوتا ہے، محبت الٰہی سے معمور ہوتا ہے۔ یہی لوگ دراصل حقیقی انسان کا مصداق ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ انسان ظاہر کے اعتبار سے تو بہت ہوتے ہیں؛ لیکن ظاہری اعتبار سے انسان کا ہونا انسانیت کے لیے کافی نہیں ہے؛ بل کہ دل کا بنا ہوا ہونا ضروری ہے اور انسانوں کی فلاح ونجات کا دارومدار بھی دل کے بننے وسنورنے پر ہے، ظاہر کے سنورنے پر نہیں۔

انسان دل کو بنانے کا مکلّف ہے

جو حدیث میں نے آپ کے سامنے پڑھی ہے، اس میں اللہ کے نبی

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دلوں کو سنوارنے کی اور دل کو دل بنانے کی تعلیم دے رہے ہیں۔

ایک دوسری حدیث میں اللہ کے نبی صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا:

”إِنَّ اللّٰهَ لَايَنْظُرُ إِلٰى صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ“ (مسلم: ۲۵۶۴)

(بلا شبہ اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا؛ بل کہ وہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے)

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ ہم اپنے دلوں کو بنالیں، ظاہر بنانا ہمارا کام نہیں، ظاہر تو اللہ نے بنا دیا ہے، جس کو جیسی شکل دینی تھی، اللہ نے دے دی۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿يَاأَيُّهَاالْإِنْسَانُ مَاغَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ فِيْ أَيِّ صُوْرَةٍ مَاشَاءَ رَكَّبَكَ﴾ (اے انسان! تجھے کس چیز نے اپنے اس رب کریم سے دھوکہ میں ڈال رکھا ہے، جس نے تجھے پیدا کیا، پھر تیرے اعضا کو درست کیا، پھر تجھے اعتدال کے ساتھ بنایا، پھر تجھے جس شکل میں چاہا ترکیب دیا) [الإنفطار: ٦]

اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ میں تو جسم بنا چکا، رنگت وصورت بھی تجھے جتنی دینی تھی دے دی، اب کوئی گورا، کالا یا کوئی کالا، گورا نہیں ہوسکتا اور میرے نزدیک اس ظاہر پر فیصلے ہونے والے بھی نہیں ہیں، فیصلے تو باطن پر ہونے والے ہیں۔

معلوم ہوا کہ انسان دل کو بنانے کا مکلّف ہے اور اسی پر نجات کا مدار ہے۔

خوبصورتی نے ابولہب کو کامیاب نہیں کیا

جی ہاں! جب ظاہر پر آخرت میں فیصلے ہونے والے نہیں ہیں، تو کسی کا حسین

ہونا، اس کی کامیابی کی دلیل نہیں اور کسی کا بدصورت ہونا، اس کی ناکامی کی دلیل نہیں؛ اگر ایسا ہوتا، تو ابوجہل کے بارے میں آتا ہے کہ وہ بہت خوبصورت تھا اور ابولہب کے بارے میں تو آتا ہے کہ وہ بہت ہی حسین وجمیل تھا، اس کا اصل نام تو عبدالعزیٰ تھا؛ لیکن اس کو لوگوں نے ابولہب اس لیے کہا کہ وہ بڑا حسین وخوبصورت تھا، عربی میں ''لہب'' کے معنی آتے ہیں ''آگ کی لپٹیں''۔ جب آگ اٹھتی ہے، تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس کی لپٹوں میں کیسی چمک ہوتی ہے اور کتنی خوبصورتی ہوتی ہے، جی چاہتا ہے کہ پکڑ لیں؛ لیکن نتیجہ معلوم ہے؛ اس لیے نہیں پکڑتے۔

ابولہب بھی اسی طرح بڑا ہی خوبصورت تھا، چہرے پر اندر سے خون کی ڈوریاں ایسی محسوس ہوتی تھیں، جیسی کہ آگ کی لپٹیں آرہی ہوں۔ اسی وجہ سے لوگوں نے اسے ''ابولہب'' کہا۔ لیکن قرآن میں اس کے بارے میں کہا گیا:

﴿تَبَّتْ يَدَاأَبِي لَهَبٍ وَّتَبَّ مَاأَغْنٰى عَنْهُ مَالُهُ وَمَاكَسَبَ سَيَصْلٰى نَارًاذَاتَ لَهَبٍ﴾ [اللهب: ۱]

(ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ برباد ہو جائے، نہ اس کا مال اس کے کام آیا اور نہ اس کی کمائی۔ عنقریب وہ ایک شعلہ زن آگ میں داخل ہوگا) اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے اسی ''ابولہب'' کے ساتھ ملا کر یہ کہہ دیا کہ یہ ظاہر میں ابولہب تھا اور حقیقت میں بھی آگ میں جانے کے قابل ہے، عنقریب وہ جہنم میں جائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کا ظاہری حُسن اس کے کچھ کام نہ آیا، اگر ظاہری حسن کی وجہ سے کوئی کامیاب ہوتا تو ابولہب ناکام نہ ہوتا۔

بدصورتی نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو ناکام نہیں کیا

اچھا! اب اس کے مقابلے میں حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کو دیکھیے کہ وہ ظاہر میں

کالے کلوٹے تھے، بظاہر بدصورت تھے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو اتنا اونچا مقام و مرتبہ عطا کیا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار بعد نمازِ فجر کے بعد حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اے بلال! مجھے بتاؤ کہ تم نے اسلام میں وہ کونسا عمل کیا ہے، جو زیادہ قابلِ امید یعنی ثواب کی امید والا ہے؛ کیوں کہ میں نے جنت میں میرے آگے تمہارے جوتوں کی آواز محسوس کی ہے۔ حضرت بلال نے عرض کیا کہ میں نے جب بھی وضو کیا، رات میں یا دن میں، تو ضرور حسبِ توفیق نماز پڑھی ہے۔

(بخاري: ۱۱۴۹)

یہ واقعہ بعض علما کے نزدیک معراج کا ہے اور بعض نے اس کو ترجیح دی ہے کہ یہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا تھا۔

بھائیو! یہ بلال حبشی رضی اللہ عنہ کا مقام ہے، صورت میں تو کالے و بھونڈے؛ لیکن اللہ کے نزدیک ان کا مقام و مرتبہ اتنا اونچا؛ اس لیے کہ انھوں نے اپنے دل کو دل بنالیا تھا، جنھوں نے بھی اپنے دل کو دل بنالیا، ان کا یہ مقام ہوتا ہے اور جنھوں نے اپنے دل کو پتھر کی سِل بنالیا، ان کا انجام بھی آپ نے سن لیا کہ ابولہب کا کیا حشر ہوا؟

تو معلوم ہوا کہ اصل چیز دل کو بنانے کی محنت ہے، اس لیے آدمی کو چاہیے کہ اپنے دل کو بنانے کی فکر میں لگ جائے اور اپنے آپ کو واقعی انسان بنانے کی فکر میں اور جدوجہد میں لگادے۔

افسوس کہ ہم ظاہر کے سنوارنے میں لگ گئے

عجیب بات؛ بل کہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو ہمارے جسموں کو بنا کر بھیج دیا ہے اور بہت ہی عمدہ بنا کر بھیجا ہے؛ لیکن پھر بھی ہم اپنے جسموں ہی کے بنانے میں لگے ہیں، عورتیں اپنے آپ کو حسین و خوبصورت بنانے کے لیے بیوٹی پارلر (BEAUTY PARLOUR) جاتی ہیں، چہروں کی خوبصورتی کے لیے

ہزاروں روپے خرچ کرتی ہیں، کبھی بالوں کو ٹھیک کرنے کے لیے محنت کرتی ہیں، اسی طرح کپڑے بھی عمدہ سے عمدہ پہننے کی کوشش کرتی ہیں اور کبھی ظاہری زیب وزینت کے لیے ناجائز کاموں کا بھی ارتکاب کرتی ہیں۔ مثلاً بعض عورتیں مردوں کا لباس اختیار کر لیتی ہیں، جس پر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے۔

بعض عورتیں ہتھیلیوں اور ناخنوں پر ایسا رنگ چڑھاتی ہیں، جو ان پر کوٹ ہو جاتا ہے اور وضو کے پانی کے پہنچنے کے لیے حائل بن جاتا ہے، جب پانی نہیں پہنچے گا، تو وضو نہیں ہوگا، جب وضو نہیں ہوگا، تو نماز بھی نہیں ہوگی؛ لیکن آج کل عورتوں کو حسین بننے کا اتنا شوق ہوتا ہے کہ وہ جائز و ناجائز تک کا لحاظ نہیں کرتیں۔

اسی طرح مرد حضرات بھی حسین نظر آنے کے لیے ڈاڑھی منڈا دیتے ہیں جو گناہِ کبیرہ ہے، اللہ کی خِلقت کو تبدیل کرنے کے مترادف ہے، پھر ویسے بھی کوئی ڈاڑھی منڈانے سے حسین نظر نہیں آتا؛ بل کہ اور بدشکل ہو جاتا ہے۔

بھائیو! کیا ہم سب اپنے دلوں کے بنانے اور سجانے کی اتنی فکر کرتے ہیں؟ اتنی کوشش کرتے ہیں؟ محنت کرتے ہیں؟ نہیں! ہرگز نہیں۔ گناہوں کی وجہ سے دل غبار آلود؛ بل کہ زنگ آلود ہو چکا ہے، دل پر گناہوں کے سیاہ نقطے لگتے لگتے دل بالکل کالا ہو چکا ہے، ہم میں سے کتنے لوگ ہیں، جو اس دل کو منور کرنے کی فکر کرتے ہیں؟ ظاہر کو سنوارنا جو کہ ایک غیر ضروری امر ہے، اس کے پیچھے ہماری زندگیاں ختم ہو رہی ہیں، اس کے لیے ہمارے پاس وقت ہی وقت ہے؛ لیکن افسوس کہ دل کو سنوارنے کے لیے کوئی وقت نہیں ہے۔

دل کی حالت کے سلسلے میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فکر

حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بار بار دعا میں فرمایا

کرتے تھے:" اللّٰھم ثبّت قلبي علیٰ دینک" (اے اللہ! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت قدم رکھنا) اور کبھی کہتے تھے:"یامقلب القلوب ثبت قلبي علیٰ دینک" (اے دلوں کو الٹ پلٹ کرنے والے میرے دل کو تو اپنے دین پر جمادے) یہ دعائیں بار بار کرتے تھے۔

متعدد صحابہ حضرت عائشہ، حضرت اِم سلمہ، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم وغیرہ سے مروی ہے، ان میں سے ہر ایک کہتے ہیں کہ میں نے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہم غیر مسلم تھے، آپ کی بہ دولت ہم اسلام میں داخل ہوگئے، اب ہم الحمدللہ مسلمان ہیں، اس کے باوجود ہم آپ کو دیکھتے ہیں کہ آپ بار بار یہ دعا کرتے ہیں، کیا آپ کو ہمارے بارے میں کوئی اندیشہ لگا ہوا ہے؟ کیا یہ دل کبھی پلٹ جائے گا؟ سوال دیکھیے کتنا دقیق ہے؟ کتنا غور وفکر کرنے کے بعد انہوں نے یہ سوال کیا ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:"إن القلوبَ بَینَ إِصْبَعَینِ من أصابع الرحمٰن یُقَلِّبُھَا کیف یشاء" (یہ دل اللہ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں میں ہیں، وہ جس طرح چاہے ان کو الٹ پلٹ کرتا ہے)

(سنن الترمذي: ۲۱۴۰، و۳۵۲۲، الأحادیث المختارة: ۳/۳۱۰، اتحاف الخیرة المھرة : ۶۷۷۰، مشکوۃ: ۲۲)

یعنی مطلب یہ ہوا کہ ہاں ہاں یہ دل تو ایسی ہی چیز ہے کہ لمحے میں یوں تو لمحے میں یوں۔ معلوم ہوا اس سلسلے میں بڑے ہی باشعور اور متیقظ رہنے کی ضرورت ہے، یہ نہیں کہ ایسا ہی چھوڑ دیا جائے اور ایسی ہی زندگی گزار دی جائے اور اگر یوں ہی الٹ پلٹ کا سلسلہ جاری رہے ،تو صبح میں مومن ہے، تو شام میں کافر، شام میں مومن، تو صبح میں کافر ہونے کا سلسلہ رہے گا۔ کوئی شیطانی کھیل کھیل رہا ہوگا، یہاں تک کہ اسی الٹ پلٹ کے اندر اس کی زندگی گزر جائے گی اور اسی طرح وہ لبِ

گور پہنچ جائے گا، اس لیے فکر کی ضرورت ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نظر میں قابل تعظیم دل

حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام ایک دفعہ کہیں جا رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت سے معجزات عطا کیے تھے، اس میں ایک معجزہ ان کا یہ تھا کہ وہ مردوں کو زندہ کرتے تھے، راستے میں ایک جگہ قبرستان پر سے گذر ہوا، ان کے اور کچھ حواریین ان کے ساتھ تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ وہاں ایک کھوپڑی پڑی ہوئی ہے، اس کھوپڑی کو اٹھایا اور اس کے کان کے سوراخ میں انہوں نے کچھ ڈالنا چاہا؛ لیکن اس میں وہ چیز داخل نہیں ہوئی، حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے اس کھوپڑی کو زور سے پھینک دیا، پھر آگے بڑھے، ایک اور کھوپڑی ان کو نظر آئی، اس کھوپڑی کو اٹھایا اور اس میں بھی انہوں نے کوئی چیز کان کی طرف سے گھسانی چاہی، تو وہ اندر گھس گئی اور دوسری طرف سے نکل گئی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کھوپڑی کو بھی زور سے پھینک دیا اور پھر اس کے بعد ایک اور کھوپڑی ملی، اس کھوپڑی کو بھی اٹھایا، پھر اس میں بھی کچھ داخل کیا، تو ایک کان میں وہ چیز گھس کر اندر ہی رہ گئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کو بوسہ دیا اور پھر ادب سے لے جا کر ایک جگہ دفن کر دیا، آپ کے حواریوں نے پوچھا کہ حضرت! یہ کیا ماجرا ہے؟ کہ ایک کھوپڑی کو آپ نے دیکھا پھینک دیا اور ایک کھوپڑی کو دیکھا اس کو پھینک دیا یہ تیسری کھوپڑی اٹھائی اور پھر اس کو دیکھا، بوسہ دیا، لے جا کر دفن کیا۔ کیا قصہ ہے؟

عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: پہلی کھوپڑی وہ ہے کہ اس کے کان میں کوئی حق بات گھستی ہی نہیں تھی، یہ اتنا بڑا کافر تھا کہ اللہ کے پیغمبر اس کے پاس آتے تھے، اللہ کی باتیں اس کو سنائی جاتی تھیں؛ لیکن اتنی سختی اس کے اندر پیدا ہوگئی تھی کہ اس سختی کا اثر

کانوں پر بھی ہو گیا تھا؛ اس لیے کان اس بات کو سنتے بھی نہیں تھے، اس لیے میں نے اس کھوپڑی کو اٹھا کر پھینک دیا کہ یہ قابلِ تعظیم و تکریم نہیں ہے ؛ بل کہ یہ تو قابلِ توہین ہے، قابلِ تذلیل ہے۔ دوسری جو کھوپڑی ملی وہ مومن کی کھوپڑی تھی، وہ مومن تھا، مانتا تھا، سنتا تھا، لیکن ایک طرف سے سن کر دوسری طرف سے نکال دیتا تھا؛ اسی بات کی جانب اشارہ تھا، اس چیز میں بھی جس کو میں نے اس کے کان میں داخل کیا تھا کہ وہ بھی ایک طرف سے داخل ہو کر دوسری طرف سے نکل گئی۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ کے دین کی باتیں سنتا تھا؛ لیکن وہ دل میں نہیں اترتی تھی اور اس کا دل اس قدر سخت تھا کہ کان تو اسے سنتے تھے؛ لیکن دل اس کا قبول نہیں کرتا تھا۔ ہم میں سے بھی کتنے ایسے ہوں گے کہ قرآن سنتے ہیں، حدیث سنتے ہیں، مسائل سنتے ہیں اور دین کی باتیں سنتے ہیں؛ لیکن وہ ادھر سے سنتے ہیں، ادھر سے نکال دیتے ہیں، دل کے اندر گھسنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔

پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے اس کو بھی قابلِ تعظیم نہیں سمجھا؛ اس لیے اس کو بھی پھینک دیا۔

اور جو تیسری کھوپڑی ملی تھی یہ مومنِ کامل کی کھوپڑی تھی، مومن بھی تھا، مومنِ کامل بھی تھا، کمال اس کے اندر تھا، انبیا کی باتیں، اللہ کے دین کی باتیں سنتا تھا؛ لیکن ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالتا نہیں تھا؛ بل کہ ایک کان سے سنتا تھا اور دل کے اندر اتار لیتا تھا؛ اس لیے جب میں نے اس کے کان میں وہ چیز ڈالی، تو اندر رہ گئی۔

بھائیو! سوچنے کی ضرورت ہے آج ہمارے دلوں کا کیا حال ہے؟ اس کے اندر سختی کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی ہے۔ دین کی باتیں دل میں اثر ہی نہیں کر رہی

ہیں۔ دلوں کی سختی کو ہٹایا جائے اور دلوں کو نرم کیا جائے، اس کے لیے محنت کرنا ہوگا اور کسی بھٹی میں ڈال کر اس کو تپانا اور پکانا ہوگا۔

دل کے اندر معرفت کا چشمہ جاری کرلیں-ایک تمثیلی واقعہ

مولانا روم رَحِمَہُ اللّٰہُ نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک جگہ ایک بادشاہ تھا اور بادشاہ نے عالی شان محل بنایا، بہت بڑا لمبا چوڑا بنا دینے کے بعد اس نے سوچا کہ یہاں پانی کا نظم بھی ہونا چاہیے؛ اس لیے کہ سب کچھ موجود ہو اور پانی ہی نہ ہو تو کیا فائدہ ہوگا؟ اور لوگ یہاں کیسے زندہ رہیں گے؟ تو وہاں قریب میں ایک نہر بہتی تھی، بادشاہ کے دماغ میں یہ بات آئی کہ اس نہر سے ایک شاخ کھود کر محل کے اندر لے لی جائے اور مختلف جگہ پر اس کو بہا دیا جائے اور اس طرح بہا دینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سب جگہ پانی بھی پہنچتا رہے گا اور دیکھنے میں حسین اور خوبصورت بھی لگے گا۔

اس نے اپنے مشیروں کو بلایا اور ان سے مشورہ کرنے لگا کہ دیکھو ہمارے محل میں پانی کا کوئی نظم نہیں ہے؛ لیکن ہمارے محل کے باہر ذرا سے فاصلے پر ایک بہت بڑی نہر بہتی ہے، جس کا پانی بڑا ہی صاف وشفاف اور بڑا ہی حلاوت آمیز ہے، اس نہر کی ایک شاخ کاٹ کر میں اپنے محل میں جاری کرنا چاہتا ہوں۔ کیا رائے ہے؟ تو سب نے کہا کہ حضور بہت اچھا، اس سے زیادہ اور کیا بہتر ہوگا؟ ایک آدمی کہنے لگا کہ نہیں نہیں! یہ بہتر نہیں؛ بل کہ خطرناک ہے۔ بادشاہ نے پوچھا کیوں؟ کیا خطرہ ہے؟ اس آدمی نے کہا کہ نہیں میری رائے یہ ہے کہ باہر کی نہر اندر لانے کے بجائے اندر ہی کنویں کھود لیے جائیں، مختلف جگہوں پر کنویں کھود لیے جائیں اور یہ کنویں اندر ہوں گے اور آپ جتنا چاہیں پانی نکال سکتے ہیں۔

لیکن بادشاہ نے کہا کہ یہ دیکھنے میں اچھا نہیں معلوم ہوتا، یہ بڑا اچھا معلوم ہوتا ہے کہ ایک نہر ہمارے محل کے اندر کاٹ کر لائی جائے اور اسے مختلف جگہوں پر بہایا جائے، اس میں حُسن اور خوبصورتی ہے اور پھر پانی کا پانی بھی۔

اس آدمی نے کہا کہ میری تو رائے یہی ہے کہ اندر نہر کھودی جائے، باہر سے نہر نہ لائی جائے؛ لیکن چوں کہ وہاں اکثریت کی رائے بادشاہ کی رائے کے موافق تھی؛ لہٰذا اسی پر عمل کیا گیا اور نہر کاٹ کر محل میں لے لی گئی، پانی بہترین آ رہا تھا، خوش نما بھی لگ رہا تھا، لوگ اس سے استفادہ اور انتفاع بھی کر رہے تھے اور زندگی بڑی اچھی گزر رہی تھی۔

لیکن چند سالوں بعد ایک اور ملک کے بادشاہ نے اس ملک پر حملہ کرنا چاہا اور دونوں کے درمیان ایک سیاسی جنگ چھڑ گئی، اس جنگ کا ارادہ کرنے کے بعد وہ بادشاہ اپنے تمام لشکر کے ساتھ آ کر اس کے محل کا محاصرہ کرلیا اور محاصرہ کرنے کے بعد سب سے پہلے جو کام اس نے کیا، وہ یہ تھا کہ اس کے محل کے لیے جس نہر سے پانی بہتا تھا، وہاں ایک مینڈھ لگا دیا اور آ کر براجمان ہو کر بیٹھ گیا کہ اب باہر کا پانی اندر نہیں جائے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو پانی اندر جا چکا تھا وہ تو جا چکا تھا؛ لیکن اب باہر سے اندر کے لیے پانی پر مینڈھ لگ چکی تھی اور اندر جو پانی تھا، وہ خرچ ہوتا رہا، ہوتا رہا یہاں تک کہ ایک دن پانی ہی بند ہو گیا، اب بادشاہ اور تمام ارکانِ سلطنت پریشان کہ اب کیا ہوگا؟ پانی تو ان لوگوں نے بند کر دیا ہے۔

اب وہ مشیر آیا، جس نے بادشاہ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ حضور محل کے اندر نہر سے شاخ لانے کا ارادہ نہ کیجیے گا کہ یہ بڑا خطرناک کام ہے، اس نے آ کر کہا کہ حضور میں نے تو آپ کو پہلے ہی آگاہ و متنبہ کر دیا تھا کہ آپ جو باہر کی لذت اندر لانے کی

کوشش کر رہے ہیں، یہ بڑا خطرناک کام ہے کہ اگر کوئی یہاں آ کر بیٹھ جائے، جیسے یہ بیٹھ گیا، تو خطرہ پیش آنے کا امکان تھا؛ اسی لیے میں نے آپ کو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ باہر کی چیز اندر لانے کے بہ جائے اپنے اندر سے ہی پانی پیدا کرلیں۔ اب وہ سر پکڑ کر پیٹنے لگا اور کہنے لگا کہ ہاں بھائی! تیری بات تو مجھے اس وقت سمجھ میں نہیں آئی، اب سمجھ میں آرہی ہے۔

بس مولانا روم رحمۃ اللہ نے یہ واقعہ بیان فرما کر تمام سالکینِ طریقت کو یہ سبق دیا ہے کہ تمہاری یہ جو (Body) ہے، اسے بادشاہ کا محل سمجھو، اس بادشاہ کے محل کے اندر ایک دل موجود ہے، اس دل کے اندر آپ معرفت کا چشمہ جاری کرسکتے ہیں، محبتِ الٰہی کا چشمہ جاری کرسکتے ہیں، خوفِ خداوندی کا چشمہ کھود سکتے ہیں، اس کے اندر صبر وتوکل کے چشمے جاری کرسکتے ہیں؛ لیکن عام طور پر لوگ یہ کرتے ہیں کہ باہر کی لذتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے آنکھ سے اور کان سے اور ہاتھ وپیر سے لذت لیتے ہیں یہ باہر کی لذت ہے، جو باہر کا پانی آپ کو دیتی رہتی ہے اور وہ بھی سڑا ہوا پانی آپ کو دیتی ہے، اچھا پانی بھی نہیں دیتی، یہ باہر کا سڑا ہوا اور گندا وگدلا پانی آپ کی آنکھ کے ذریعے، آپ کے کانوں کے ذریعے، آپ کے دل میں پڑ رہا ہے اور آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ مجھے مزہ آرہا ہے؛ لیکن جوں ہی اس (Body) کا مخالف یعنی موت کا فرشتہ آجائے گا اور باڑ لگا دے گا، تو سوائے اس کے کہ اندر اندھیرا چھا جائے گا اور کیا رہے گا؟

کہتے ہیں کہ اب پہلے سے چشموں کا تو اندر کوئی انتظام نہیں ہے، معرفت ومحبت کا چشمہ وہاں نہیں ہے، خوفِ خداوندی کا چشمہ وہاں نہیں ہے؛ اسی طرح دیگر چشمے وہاں نہیں ہیں، دل کو سیراب کرنے کا کوئی نظام وہاں اندر نہیں بنایا گیا اور یہ باہر کی

لذتیں اس وقت بند ہو جاتی ہیں، جس وقت موت کا فرشتہ آ کر موت کا حملہ کر دیتا ہے۔ اب اس میت سے پوچھ لیجیے کہ کیا آنکھ سے مزہ آ رہا ہے؟ کان سے مزہ آ رہا ہے؟ سننے، دیکھنے اور پکڑنے کے مزے آ رہے ہیں؟ اور مختلف قسم کے مزے تو لے کر زندگی گذار رہا تھا، کیا ان میں سے کوئی مزہ تجھ کو آ رہا ہے؟ وہ بزبانِ حال کہے گا کہ نہیں، سب بے کار ہے، کچھ بھی مزہ نہیں آ رہا ہے، یہ ہے "ھاضم اللذات" کا حملہ، جب باہر سے حملہ ہو جائے گا، تو بھائیو! باہر کی کوئی چیز کام نہیں آئے گی۔

اب سوال یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ جواب یہی ہے کہ جیسے اس مشیر نے بادشاہ کو رائے دی تھی کہ محل کے اندر ایک نہر کھودنے کی ضرورت ہے، اسی طرح دل کے اندر ایک نہر محبتِ الٰہیہ کی کھودنے کی ضرورت ہے، ایک نہر معرفتِ الٰہیہ کی کھودنے کی ضرورت ہے، ایک خشیتِ الٰہیہ کی کھودنے کی ضرورت ہے؛ تاکہ جب موت کا فرشتہ حملہ کر کے باہر کی لذتوں کو روک دے گا، تب بھی دل کی لذتوں سے آپ سیراب ہوتے رہیں، اس پر کوئی روک نہیں لگا سکتا۔

اگر کوئی دل کے اندر یہ خزانے پیدا کرنے کے بہ جائے ظاہری اعضا کے بنانے وسنوارنے میں لگ جائے گا، تو اسے قیامت کے دن بہت افسوس ہوگا؛ مگر وہاں افسوس کرنا کچھ کام نہ آئے گا۔

ذکر اللہ سے غافل دل مردہ ہوتا ہے

ایک مرتبہ ایک شخص حضرت بایزید بسطامی رَحِمَہُ اللہُ سے ملاقات کے شوق میں اپنے وطن سے نکلا، سفر کرتا ہوا ایک راستے میں ایک جگہ درخت کے سایے میں آرام کرنے لیٹا تو دیکھا کہ دو چڑیاں آپس میں بات کر رہی ہیں اور یہ شخص

چڑیوں کی بولی جانتا تھا۔

ان میں سے ایک چڑیا دوسری چڑیا سے کہہ رہی تھی کہ معلوم ہے یہ آدمی جو درخت کہ نیچے ہے، کہاں جارہا ہے؟ دوسری چڑیا نے کہا: ہاں یہ بایزید بسطامی کے پاس جارہا ہے، تو اس چڑیا نے کہا: ان کا تو انتقال ہوگیا، یہ شخص یہ بات سن کر پریشان ہوا اور واپسی کا ارادہ کرلیا، پھر سوچا کہ جب نکلا ہی ہوں، تو جا کر زیارت کرلوں، پھر آگے سفر جاری رکھا اور بایزید بسطامی رحمہ اللہ کے پاس پہنچا، تو دیکھا کہ وہ تو باحیات ہیں، ملاقات کی، گفت وشنید کے بعد رخصتی کے وقت کہنے لگا کہ حضرت! ایک بات پوچھنا ہے، پھر چڑیا والا سارا قصہ سنایا، بایزید بسطامی چونکے اور دریافت کیا کہ یہ کس دن اور کس وقت کا واقعہ ہے؟ اس نے بتایا کہ فلاں دن اور فلاں وقت کا واقعہ ہے، حضرت بایزید رحمہ اللہ کہنے لگے کہ ہاں بھائی! چڑیا سچ کہہ رہی تھی، اس وقت کچھ دیر کے لیے میرا دل اللہ کی یاد سے غافل ہوگیا تھا، اللہ کی یاد سے دل کا غافل ہونا، دل کا مردہ ہونا ہے۔

اللہ اکبر! ہمارا حال کیا ہے، ان کا دل تو کچھ دیر کے لیے مردہ ہوا تھا، ہمارا دل ہمیشہ مردہ رہتا ہے، ہم اللہ کا ذکر ہی نہیں کرتے، عجیب اور حیرت انگیز واقعہ ہے، اس واقعہ سے ہمیں عبرت حاصل کرنا چاہیے اور ہمیشہ اللہ کا ذکر کرنا اور اس کا دھیان رکھنا چاہیے، تاکہ دل مردہ نہ ہو۔

حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ کی ایک تقریر کا خلاصہ

مجھے میرے حضرت مسیح الامت نور اللہ مرقدہٗ کی ایک تقریر یاد آگئی، وہ یہ کہ آپ نے ایک دفعہ ایک حدیث پڑھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے گھروں کو صاف کرنے کے بعد یہودیوں کی طرح اپنے صحن کو ناپاک نہ رکھو،

اس لیے کہ یہودی ایسا ہی کرتے ہیں''۔ (مشکوٰۃ:۳۵۸)

یہ حدیث سنا کر حضرت نے فرمایا کہ جب رسول اللہ ﷺ گھر کے باہر کے حصے کو بھی ناپاک اور گندہ رکھنے کی اجازت نہیں دیتے اور اس کو بھی صاف کرنے کا حکم دیتے ہیں تو گھر کی صفائی کرنے کا تو بدرجۂ اولیٰ حکم ہوگا، اور جب گھر کی صفائی کا حکم ہے، تو ہمارے کپڑوں کو صاف کرنے کا تو اس سے زیادہ حکم ہوگا، اس لیے کہ گھر تو ہم کو لگا ہوا نہیں رہتا، کپڑے تو ہمارے جسم سے لگے ہوئے ہوتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ جب کپڑوں کی صفائی کا حکم ہے، تو وہ جسم جس کے لیے کپڑے ہیں وہ کیوں پاک نہیں ہونے چاہئیں؟ وہ تو اس سے زیادہ پاک ہونے چاہئیں اور جب ظاہری جسم کو پاک کرنے کا حکم ہے، تو اس جسم کا جو اصل ہے یعنی اندورن و باطن جس کو قلب کہتے ہیں، اس کی صفائی تو سب سے زیادہ ہونا چاہیے، اس لیے کہ قلب اصل ہے، ظاہری جسم اس کی سواری کی طرح ہے، تو جب ظاہری جسم ہی کو دھونے کا حکم دیا گیا ہے، تو اندر والے کو کیوں حکم نہیں ہوگا کہ وہ پاک وصاف رہے۔

جیسے کار کو دھونے کا حکم ہو تو اندر کار میں بیٹھنے والے صاحب کیا پاخانہ سے ملوث رہیں گے؟ بھائیو! جب ہم کار کے بارے میں چاہتے ہیں کہ اس کی ویل بھی پاک ہو اور اس کا اوپر والا حصہ بھی صاف ہو، پیچھے کیچڑ نہ لگا ہو، سامنے کچھ نہ لگا ہو، دھول نہ لگی ہو، تو کیا ہم کار کے اندر ایسے شخص کو بٹھانا گوارا کریں گے، جو ایک گندے نالے میں ڈوبا ہوا ہو؟ کیا کوئی اس کو سیدھے لا کر سیٹ پر بٹھا دے، تو ہم گوارا کریں گے؟ نہیں، اسی طرح جسم تو ہو صاف؛ مگر دل ہو گندہ تو اللہ کو یہ کیسے پسند آئے گا؟

جب اوپر کے حصے کو اتنا صاف کر رہے ہیں، تو اندر بیٹھنے والا تو سب سے زیادہ صاف ہونا چاہیے۔ جب ہمارے جسم کو ہم صاف کر رہے ہیں، جو کہ کار کے مانند ہے تو اندر جو کار میں بیٹھنے والا ہے، یعنی دل وہ تو اس سے زیادہ پاک وصاف ہونا چاہیے۔
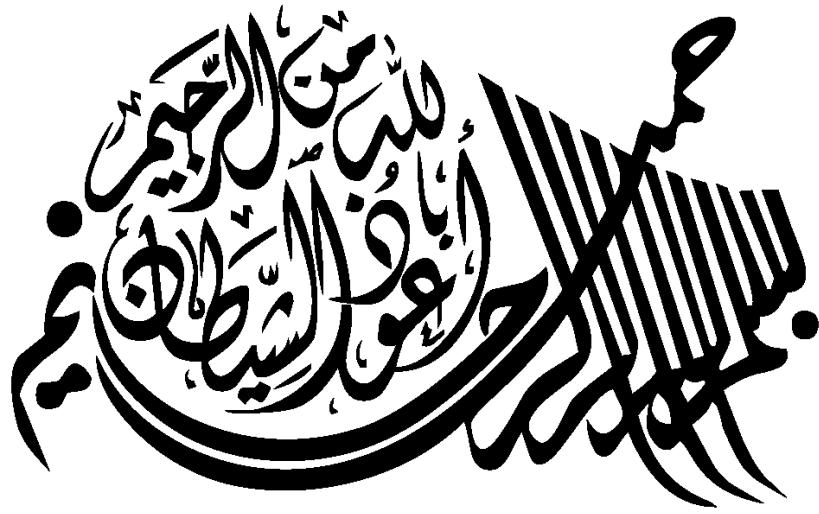
دلوں
پر دو قسم کے
حملے

باسمہٖ تعالیٰ

دلوں پر دو قسم کے حملے

الحمد للّٰہ و کفیٰ و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ أما بعد:

﴿قَالَ النَّبِيُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ أَ لَا! إِنَّ فِيْ الْجَسَدِ لَمُضْغَةً إِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ، فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا !وَهِيَ الْقَلْبُ﴾

(آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: گوشِ ہوش سے سن لو! بلا شبہ جسم میں ایک لوتھڑا ہے، جب وہ درست ہوتا ہے، تو سارا جسم درست رہتا ہے اور جب وہ فاسد ہو جاتا ہے، تو سارا بدن فاسد ہو جاتا ہے اور سن لو! وہ دل ہے)

(بخاري: ۱/۱۳، مسلم: ۲/۸۲)

دل اللہ تعالیٰ کی بہت عظیم اور بے بہا نعمت ہے اور بہت ساری خوبیوں اور کمالات کا جامع ہے اور جو چیز کمال والی ہوتی ہے، اس کے دشمن بھی ہوتے ہیں اور وہ دشمن اس پر حملہ بھی کرتے رہتے ہیں، اس وجہ سے دل کے اوپر بھی اس کے دشمنوں کی جانب سے حملہ ہوتا رہتا ہے اور انسانی قلب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہت جلد متأثر ہو جاتا ہے، اس لیے قلب پر ہونے والے حملوں کو جاننا و سمجھنا لازمی و ضروری ہے تا کہ ہم دل کو محفوظ رکھ سکیں۔

جیسا کہ ایک حدیث میں ہے:

" إن هذا القَلْبَ كَرِيْشَةٍ بِفَلاةٍ مِنَ الْأَرْضِ يُقِيْمُهَا الرِّيْحُ ظَهْراً لِبَطْنٍ "

(بلاشبہ یہ دل ایک پَر کی طرح ہے، جو ایک کھلے میدان میں پڑا ہوا ہو اور جس کو ہوا الٹا سیدھا گھماتی پھراتی رہتی ہو)

(مسند احمد:۱۹۷۵۷ ، شعب الایمان : ۱/۴۷۴)

اب سنیے! علماء لکھتے ہیں کہ دل پر جو حملے ہوتے ہیں وہ دو قسم کے حملے ہیں: (۱) ایک شہوات کا حملہ ہوتا ہے (۲) اور دوسرے شبہات کا حملہ ہوتا ہے۔

دل پر شبہات کا حملہ

شبہات کا مطلب یہ ہے کہ مختلف قسم کے ایسے خیالات اور وسوسے جن کی وجہ سے دل میں اسلام اور ایمان، دینی حقائق اور اسلامی عقائد کے بارے میں انسان متشکک ہو جائے اور شک و شبے میں مبتلا ہو جائے۔

یہ شبہات کا حملہ بہت سخت ترین حملہ ہوتا ہے، جس کی وجہ اس کے دل کی کائنات بگڑ جاتی ہے، دل کی دنیا خطرے میں پڑ جاتی ہے؛ یہاں تک کہ اس کا ایمان ضائع ہو کر وہ کافر بن جاتا ہے۔

جہاں تک مسئلہ ہے شبہات کا، اس وقت میں اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا؛ اس لیے کہ الحمدللہ یہاں پر بیٹھے ہوئے سبھی حضرات دین کے بارے میں کسی بھی شک و شبے میں مبتلا نہیں ہیں، دین کے اوپر ان کو استحکام ہے، دین کی باتوں پر ان کو یقین ہے، موقعہ ہوگا اور ضرورت ہوگی، تو کسی وقت اس پر بھی تفصیلی کلام کروں گا۔

دل پر شہوات کا حملہ

اب لیجیے! دل پر ہونے والے دوسرے حملے کو اور وہ شہوات کا حملہ ہے، شہوات

کے معنے ہیں خواہشات ولذات، یہ شہوات اور خواہشات کا حملہ جب انسان کے دل پر ہوتا ہے، تو دل پر اس حملے کی وجہ سے اس کے بہت سارے اعضا متأثر ہوتے ہیں، صرف ایک جگہ اس کا اثر نہیں ہوتا؛ بل کہ بہت سارے اعضا پر اس کا اثر ہوتا ہے آنکھ پر اس کا اثر، زبان پر اس کا اثر، کانوں پر اس کا اثر، ہاتھ پیر پر اس کا اثر، پیٹ پر اس کا اثر، فرج اور شرمگاہ پر اس کا اثر۔

غرض یہ کہ اوپر سے نیچے تک انسانی جسم کے سارے اعضا پر شہوتوں کے اس حملے کی وجہ سے تأثر پیدا ہوتا ہے، یہ عام طور پر تو ہم جانتے ہیں، سمجھ سکتے ہیں کہ کبھی کبھی یہ شہوتیں اس قدر آگے بڑھتی ہیں اور انسان ان میں اس قدر منہمک ہو جاتا ہے کہ انسان کو یہ کفر میں بھی پھنسا دیتی ہیں۔ مال کی خواہش، عورت کی خواہش، سامان کی خواہش، ان خواہشوں سے کبھی انسان اپنا ایمان بھی کھو بیٹھتا ہے۔

غور کریں کہ شہوات کا حملہ کس قدر سخت ہوتا ہے اور اس کے سلسلے میں کس قسم کی شہوتیں انسان میں پیدا ہوتی ہیں؟ آج کل جو ماحول ہے، اس ماحول کے لحاظ سے شہوات کے حملے کو سمجھنا بہت ضروری ہے، ایک طویل زمانہ ایسا گذر گیا کہ اس کے اندر آج کل کی طرح شہوات کا حملہ کرنے والے اس قدر زیادہ اسباب نہیں تھے، تھے تو بہت کم تھے؛ لیکن اس زمانہ کے اندر شہوات پر حملہ کرنے کے جو اسباب ہیں، وہ اس قدر کثیر ہو گئے ہیں کہ جہاں تک آپ نگاہ ڈالتے جائیں گے، وہاں وہاں تک آپ کو ایسے اسباب ملیں گے۔

کوئی راستہ اس سے خالی نہیں، کوئی چیز اس سے خالی نہیں، آپ صابن خریدیں، کوئی دوا خریدیں، کوئی مٹھائی خریدیں، کوئی استعمال کی چیز خریدیں، ہر ایک پر عورت کی ننگی تصویر آپ کو ملے گی؛ لیکن آدمی بے خبری کے ساتھ ان چیزوں کو لیتا ہے، ان

چیزوں پر نظر ڈالتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کے دل کی حالت خراب ہو جاتی ہے اور خرابی بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھ جاتی ہے کہ اندازہ بھی نہیں ہوتا کہ کہاں تک بڑھ گئی؛ اس لیے میں نے عرض کیا کہ اس زمانہ کا بہت بڑا مسئلہ، سخت ترین مسئلہ یہ ہے کہ دل پر ہونے والے اس حملے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے، جس کا نام ہے شہوات کا حملہ، جو جوانوں پر بھی ہوتا ہے، بوڑھوں پر بھی اور آج کل انٹرنیٹ (INTERNET) کی وجہ سے اور اسی طرح مختلف اس قسم کے اسباب کی وجہ سے بچوں پر بھی یہ حملہ ہوتا جارہا ہے۔ اسی بات سے اس کی شدت اور اس کی وسعت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

زبان کی شہوت کے ذریعے دل پر حملہ

جیسا کہ میں نے عرض کیا شہوات کا حملہ ایک موقعہ اور ایک عضو پر ہی نہیں ہوتا؛ بل کہ اس کا حملہ بہت سے اعضا پر ہوتا ہے، ان میں سے ایک زبان بھی ہے، جس پر شہوات کا حملہ ہوتا ہے۔

زبان کی شہوت یہ ہے کہ بولنے کا چسکا لگ جائے، آدمی کو بولنے کی خواہش پیدا ہوگئی، اچھا بولو، بُرا بولو، غیبت کرو، جھوٹ بولا کرو، کسی پر الزام تراشی کیا کرو۔ غرض یہ کہ معلوم نہیں کیا کیا اس کی زبان سے نکل رہا ہے؛ مگر شوق ہے بولنے کا اور بولنے کی وجہ سے زبان کو کنٹرول نہیں ہے، بولتا چلا جارہا ہے۔

اسی لیے بعض اکابر علما نے فرمایا ہے کہ: "من كثر كلامه كثر سقطه"
(جو زیادہ بولتا ہے، اس کی غلطیاں بھی زیادہ ہوتی ہیں)
لہٰذا جو کم بولتا ہے، وہ کم غلط بولتا ہے اور جو بالکل نہیں بولتا، وہ غلط ہی نہیں بولتا۔

بولنے کی بیماری سخت ترین بیماری ہے اور اس پر انسان کو بہت کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں ایک صحابی آئے، انہوں نے عرض کیا: ''یارسولَ اللّٰه ما النجاة ؟ نجات کیسے حاصل ہوگی؟ اللہ کے نبی عَلَیْہِ السَّلَام نے فرمایا: '' أَمْلِکْ عَلَیکَ لِسَانَکَ وَلْیَسَعْکَ بَیْتُکَ وَ ابْکِ عَلٰی خَطِیْئَتِکَ '' (اپنی زبان کو قابو میں رکھو، اپنے گھر میں بیٹھے رہو اور اپنے گناہوں پر رویا کرو)

(ترمذي: ۲۴۰۶، مسند أحمد: ۲۲۲۸۹، شعب الإيمان: ۴/۲۲۹)

اس حدیث میں سوال کیا گیا ہے ایک صحابی کی طرف سے کہ نجات کیا ہے؟ یعنی نجات کیسے حاصل ہوگی؟

اس کے جواب میں نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے تین باتیں فرمائیں: ایک یہ کہ اپنی زبان پر کنٹرول رکھو، زبان پر کنٹرول رکھنا نجات کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے اپنی زبان پکڑ کر فرمایا کہ اس پر قابو رکھو، ان صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم! کیا زبان اتنی خطرناک چیز ہے؟ کیا اس کی وجہ سے ہمارا مؤاخذہ ہوگا؟

حضور اقدس صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: ''هَلْ يَكُبُّ النَّاسَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوهِهِمْ أَوْ مَنَاخِرِهِمْ إِلَّا حَصَائِدُ أَلْسِنَتِهِمْ '' (لوگوں کو ان کے چہروں کے بل جہنم رسید کرنے والی چیز سوائے زبان سے نکلنے والی چیزوں کے اور کیا ہے؟)

(ترمذي: ۲۶۱۶، سنن کبریٰ للنسائي: ۲/۱۲۱، مستدرک: ۲/۳۴۷)

یعنی مطلب یہ کہ زیادہ سے زیادہ جہنم میں جانے والے لوگ اسی زبان کی شہوت کی وجہ سے جائیں گے۔

اور دوسرے یہ کہا کہ اپنے گھر میں بیٹھے رہنا، اس کا مطلب یہ ہے کہ خواہ مخواہ اختلاط نہ ہو، خواہ مخواہ لوگوں سے میل جول نہ ہو، خواہ مخواہ ملاقاتیں نہ کی جائیں؛ اس لیے کہ جب ملاقاتیں کریں گے، تو زبان کنٹرول میں کہاں رہے گی؟ ملنے کے بعد بولنا ضروری ہے، ملنے کے بعد آپ نہیں بولیں، تو لوگ آپ کو احمق سمجھیں گے، اس لیے حضور اقدس صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ اپنے گھر میں بیٹھے رہو۔

تیسرے یہ فرمایا کہ اپنی خطاؤں پر رویا کرو، یہ بھی نجات کا سامان ہے؛ کیوں کہ رونے سے گناہ معاف ہوتے ہیں اور اس طرح نجات مل جاتی ہے۔

الغرض! زبان کی خواہش یہ ہے کہ انسان بولنے کا خواہش مند ہو اور اس میں اچھے و بُرے کی کوئی تمیز نہ کرے۔ جھوٹ بولے، چغلی کھائے، گالی بکے، کسی کا دل توڑے یا غیبت کرے۔

حضرت علی میاں ندوی رَحِمَهُ اللّٰهُ کی زندگی کی ایک خاص بات

حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی رَحِمَهُ اللّٰهُ کے انتقال کے بعد بہت سارے لوگوں نے مضامین لکھے، ان میں سے ایک ان کے خصوصی خادم تھے، انہوں نے ایک مضمون لکھا، اس کے اندر انھوں نے حضرت کے بہت سے فضائل، خصائل و مناقب درج کیے، جس میں ایک بات خصوصی طور سے یہ لکھی تھی کہ میں حضرت کی خدمت میں برسہا برس دن رات گذار چکا ہوں؛ لیکن کبھی کسی کی غیبت کرتے نہیں دیکھا۔ کتنا بڑا کمال ہے؟ یہ کوئی معمولی کمال نہیں ہے کہ کسی کی غیبت زبان سے نہ ہو اور برسہا برس گذر جائیں، آدمی ہر جگہ یکساں طور پر رہے کہ

کبھی غیبت ان سے سرزد نہ ہو، آپ اندازہ لگالیجیے کہ ان کا مقام و مرتبہ کیا ہوگا؟

میں نے زبان کی شہوت میں سے ایک بات ذکر کی، وہ یہ کہ انسان میں بولنے کی خواہش اور بولنے کی طلب اور جستجو پیدا ہوجائے اور اس کی وجہ سے وہ بس اچھا ہو یا بُرا ہو بولتا رہے، اب لیجیے ایک اور بات عرض ہے، وہ یہ کہ زبان کی شہوت کا ایک مطلب یہ ہے کہ مزے دار چیزیں کھانے، پینے کے لیے وہ لپکے، نہ اچھائی کا لحاظ رکھے نہ برائی کا، وہ مزہ حلال کے ذریعے آئے، تو ٹھیک، حرام کے ذریعے آئے تو بھی ٹھیک۔ انسان صرف کھانے پینے اور مزے کی فکر کرتا ہے اور اسے اس بات کی تمیز بھی نہیں ہوتی کہ وہ اچھا کھا رہا ہے کہ برا کھا رہا ہے۔ یہ بھی انسان کے لیے انتہائی خطرناک ہے، شیطان دل پر حملہ کر کے اس کو آمادہ کر لیتا کہ وہ زبان کی شہوت کے ذریعہ گناہ میں مبتلا ہو، ورنہ اگر دل آمادہ نہ ہو، تو زبان کے گناہ سے انسان بچ جاتا ہے۔

آنکھوں کی شہوت کے ذریعے دل پر حملہ

شہوات کے ذریعے حملہ جو ہوتا ہے، اس میں ایک حملہ آنکھوں کے واسطے سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل بصیرت لوگوں نے کہا: ''**العینُ رائدُ الشہوۃ**'' (آنکھ شہوت کی قاصد ہے)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا کہ: ''**العیون مصائد الشیطان**'' (آنکھیں شیطان کی شکارگاہیں ہیں)

(ادب الدنیا والدین للماوردی: ۱/۴۰۸)

اس لیے آنکھوں کی حفاظت بھی بہت ضروری ہے؛ تاکہ اس کے ذریعے ہمارے دل پر شیطان کا حملہ نہ ہوسکے۔

یاد رکھیں کہ آنکھیں شیطان کے تیروں میں سے ایک تیر ہے، جو خطرناک حد تک انسان کے دل کو برباد و تباہ کر کے چھوڑ دیتا ہے۔

اسی لیے نظر کو شیطان کا قاصد کہا گیا ہے؛ کیوں کہ اس کے ذریعے شیطان انسان کو زنا و بدکاری میں مبتلا کر دیتا ہے؛ اسی لیے قرآن میں شرم گاہ کی حفاظت کا حکم دیتے ہوے نظر بچانے اور اس کو نیچے رکھنے کا حکم بھی دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُم ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ إِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ﴾ [النور: ۳۰]

(آپ مؤمن مردوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچے رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، یہ بات ان کے لیے زیادہ پاکیزگی کا باعث ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان سب باتوں سے باخبر ہیں، جو وہ کرتے ہیں)

اس کے بعد والی آیت میں بعینہٖ یہی حکم عورتوں کو بھی دیا گیا ہے اور ان آیات میں ایک تو نگاہوں کو پست رکھنے کا حکم ہے اور دوسرے اس میں شرم گاہوں کی حفاظت کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ علما نے لکھا ہے کہ دونوں کو ایک ساتھ اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ پہلا حکم ذریعہ ہے دوسرے کا، لہٰذا آنکھوں کو نیچا رکھنا شرم گاہ کی حفاظت کا وسیلہ و ذریعہ ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”النَّظْرَةُ سَهْمٌ مِنْ سِهَامِ اِبْلِيْسَ مَسْمُوْمَةٍ،فَمَن تَرَكَهَا مِن خَوفِ اللّٰهِ، أَثَابَهُ عَزَّ وَجَلَّ إِيْمَانًا يَجِدُ حَلَاوَتَهُ فِيْ قَلْبِهٖ“

(نظر ابلیس کے زہر آلود تیروں میں سے ایک تیر ہے، پس جو شخص اللہ سے خوف کی وجہ سے اس کو ترک کر دیتا ہے اللہ عزوجل اس کو ایسے ایمان سے اس کا بدلہ عطا کرتا

ہے، جس کی لذت وہ اپنے دل میں محسوس کرے گا۔)

(مستدرک حاکم: ۳۴۹/۴، معجم کبیر طبراني: ۱۸/۹)

اورحضرت عیسی علیہ السلام سے مروی ہے: إیاکم و النظرة بعد النظرة فإنها تزرع في القلب الشهوة و كفىٰ بها لصاحبها فتنة"

(تم پہلی نظر کے بعد دوسری نظر سے بچو؛ کیوں کہ وہ دل میں شہوت پیدا کرتی ہے اور یہ بات آدمی کو فتنے میں مبتلا کرنے کے لیے کافی ہے)

(أدب الدنیا و الدین: ۴۰۸/۱، إحیاء العلوم: ۱۰۲/۳)

علامہ ابوطاہر بغدادی رحمہ اللہ نے اپنی مجلسِ وعظ میں سنایا:

عَاتَبْتُ قَلْبِيْ لَمَّا رَأَيْتُ جِسْمِيْ نَحِيْلًا

فَأَلْزَمَ الْقَلْبُ طَرْفِيْ وَقَالَ: كُنْتَ الرَّسُوْلَا

فَقَالَ طَرْفِيْ لِقَلْبِيْ بَلْ أَنْتَ كُنْتَ الْوَكِيْلَا

فَقُلْتُ: كُفَّا جَمِيْعاً تَرَكْتُمُوْنِيْ قَتِيْلًا

(میں نے اپنے دل کو ملامت کی، جب میں نے اپنے بدن کو کمزور پایا، تو دل نے آنکھ پر الزام لگایا اور کہا کہ تو ہی پیامبر تھا، پھر میری آنکھ نے دل سے کہا کہ نہیں؛ بل کہ تو ہی ذمہ دار تھا، تو میں نے کہا کہ تم دونوں بس کرو، تم نے تو مجھے مار ہی ڈالا)

الغرض! نظر سے شیطان اپنا شکار کھیلتا ہے اور اس میں بہت حد تک کامیاب ہوجاتا ہے؛ اس لیے نظر کو شیطانی حربوں میں سے ایک بڑا اور اہم ذریعہ مانا جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نظر شیطان کا بڑا حربہ اور انسان کو برائی میں مبتلا کرنے کے لیے اس کا ایک عظیم ہتھیار ہے۔ لہٰذا اس سے بچنا ضروری ہے، تاکہ قلب کی دنیا برباد نہ ہوجائے۔

کان کی شہوت کے ذریعے دل پر حملہ

اسی طرح شہوت کا حملہ کانوں سے بھی ہوتا ہے، یعنی کان کے ذریعے بھی شیطان دل پر حملہ آور ہوتا ہے؛ کیوں کہ انسان کانوں سے ناجائز و غلط باتیں سننے کا خواہش مند ہوتا ہے اور وہ کانوں سے گانے سنتا ہے، غیبتیں سنتا ہے، اللہ کی نافرمانی کی باتیں سنتا ہے۔ یہ کانوں کی خواہش ہے اور اس کی وجہ سے بھی انسان کا دل برا اور انتہائی غلط ہو جاتا ہے۔

گانے سننے کے بارے میں حدیث میں آتا ہے، اللہ کے نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

"الغِنَا يُنبِتُ النِّفَاقَ فِي الْقَلْبِ"

(گانا دل میں نفاق پیدا کرتا ہے)

(ابو داود: ۴۹۲۷، سنن بيهقي: ۱۰/ ۲۲۳)

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: " الغنا ينبت النفاق في القلب كما ينبت الماء الزرع والذكر ينبت الإيمان في القلب كما ينبت الماء الزرع " (گانا دل میں نفاق پیدا کرتا ہے جیسا کہ پانی کھیتی اگاتا ہے اور ذکر دل میں ایمان کو بڑھاتا ہے جیسا کہ پانی کھیتی کو بڑھاتا ہے)

(سنن بيهقي: ۱۰/ ۲۲۳)

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ بعض عارفین نے کہا ہے کہ گانا سننا بعض لوگوں میں نفاق اور بعض میں عناد، بعض میں جھوٹ، بعض میں فسق و فجور، بعض میں رعونت و تکبر پیدا کرتا ہے اور اس سے زیادہ تر صورتوں کا عشق اور بے حیائی کی باتوں کی پسندیدگی پیدا ہوتی ہے۔ (إغاثة اللهفان : ۱/ ۲۴۸)

یہاں پر قابلِ غور بات یہ ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے صرف اتنی بات نہیں فرمادی کہ کان سے گانے سننے پر کان خراب ہوجاتا ہے؛ بل کہ یوں فرمایا کہ دل میں خرابی پیدا ہوجاتی ہے؛ اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ جتنے بھی اعضا سے گناہ ہوتے ہیں، ان سارے اعضا کے گناہوں کا اثر دل پر ہوتا ہے اور دل خراب ہوجاتا ہے؛ اس لیے کوئی ایسی بات نہ سنی جائے، جس سے اللہ نے منع کردیا ہے، جیسے غیبتوں کا سننا، بہت سارے لوگوں کو غیبتیں سننے میں مزہ آتا ہے، لوگوں میں بہت کم لوگ ایسے ہیں، جو غیبت سنا نہیں کرتے، بعض لوگ ایسے تو ہیں کہ وہ غیبت کرتے تو نہیں؛ لیکن غیبت سن لیتے ہیں، حالاں کہ یہ دونوں کام غیبت کرنا بھی اور غیبت سننا بھی دونوں گناہ اور غلط ہیں۔

حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ کے بارے میں آتا ہے کہ حاجی صاحب کے یہاں کوئی آتا اور کسی کی غیبت کرتا یا کسی کی کوئی برائی بیان کرتا، تو حضرت اس کی پوری بات سنتے اور سننے کے بعد یہ فرماتے کہ بھائی! آپ نے یہ جتنی باتیں کہی ہیں یہ سب بس جھوٹ ہیں۔ یہ بھی ایک طریقہ تھا ان کی اصلاح کا۔

اور ایک موقعہ پر کسی نے حضرت سے آکر کہا کہ حضرت فلاں صاحب تہجد گذار ہیں؛ لیکن وہ جو تہجد پڑھتے اور ذکر کرتے ہیں، وہ اصل میں آپ لوگوں کو دکھانے کے لیے کرتے ہیں۔ حضرت نے اس کے جواب میں فرمایا کہ بھائی! وہ تو دکھانے کے لیے کرتے ہیں اور افسوس یہ ہے کہ آپ کو وہ بھی نصیب نہیں۔

یہ بھی اصلاح کا ایک طریقہ اور ڈھنگ ہے؛ تاکہ کوئی کسی کی غیبت کرنے کی ہمت نہ کرے۔

شہوت کا ایک حملہ بطن یعنی پیٹ کی جانب سے بھی ہوتا ہے؛ کیوں کہ پیٹ بھی خواہشات کا عادی ہوتا ہے۔ اسی لیے علما نے لکھا ہے کہ اس بات پر اتفاق ہے

اور اسلام کی تعلیمات سب کی سب اس بات کی مؤید ہیں کہ انسان کو کم سے کم کھانے کی عادت ڈالنی چاہیے، اصول یہ ہے کہ اتنا کھایا جائے کہ انسان چل پھر سکے، اپنے کام کاج کر سکے اور اپنی ضروریات کو پوری کر سکے، یعنی یہ نہیں کہ حلق تک کھایا جائے اور ایسا بھی نہ کرے کہ خواہ مخواہ کھانے کی عادت بنالی جائے اور اس کے لیے اچھے اچھے کھانے کی فکر ہمیشہ کی جائے، یہ فکر اچھی بات نہیں ہے، یہ شہوتِ بطن ہے اور شہوتِ بطن انسان کو ہلاکت میں ڈال دیتی ہے۔

اور آج یہ شہوتِ بطن ہی تو ہے جس کی وجہ سے انسان حلال وحرام کی تمیز کیے بغیر کمانے کی فکر میں لگا ہوا ہے، اس وجہ سے شہوتِ بطن بہت ہی خطرناک بیماری ہوتی ہے۔

یہ پیٹ کی خواہش بھی انسان کے دل پر اثر انداز ہوتی ہے اور انسان کا دل اس کی وجہ سے خبائث ورذائل کا اڈہ بن جاتا ہے۔

ایک لطیفہ

اس پر ایک لطیفہ یاد آ گیا، وہ یہ کہ ایک واعظ تھے، پرانے زمانے میں، ان کی عادت تھی کہ وہ جب بھی وعظ کہتے، تو ہر وعظ کے آخر میں ایک جملہ ضرور کہتے اور اسی پر ان کا وعظ ختم ہوتا، وہ کہتے تھے: ''سارا فساد مرچوں کا ہے''، ان کا بیان کبھی ہوتا سود کی برائی پر، کبھی ہوتا رشوت خوری کی لعنت پر، کبھی ہوتا بے نمازیوں پر، کبھی ہوتا شراب وزنا پر، وہ لوگوں کو نصیحت کرتے تھے کہ یہ نہ کرو، یہ گناہ نہ کرو، یہ حرکت نہ کرو، غرض یہ کہ وعظ کسی بھی عنوان سے ہو، وہ آخر میں ضرور یہ کہتے تھے کہ سارا فساد مرچوں کا ہے۔

لوگ سن تو لیتے تھے؛ مگر کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ مرچوں کا کیا فساد ہے؟ اور

یہ واعظ صاحب ہر وعظ کے آخر میں یہ کیوں کہتے ہیں کہ سارا فساد مرچوں کا ہے؟ ایک دن کسی نے ان سے پوچھ ہی لیا کہ حضرت آپ کا سارا وعظ تو سمجھ میں آتا ہے؛ مگر یہ آخری جملہ سمجھ میں نہیں آتا، یہ کیا ہے؟

اس پر انھوں نے بڑے مزے کا اور واقعی جواب دیا، انھوں نے کہا کہ دیکھو جتنے گناہ لوگ کرتے ہیں، ان میں سے اکثر کا تعلق کھانے پینے سے ہے کہ انسان خوب عمدہ عمدہ غذائیں کھاتا ہے اور انسان خوب اس وقت کھاتا ہے جب غذا مزے دار ہوتی ہے اور غذا مزے دار اس وقت ہوتی ہے، جب اس میں مسالہ جات خوب پڑتے ہیں اور ان مسالہ جات میں سے سب سے اول نمبر پر مرچ ہوتی؛ لہٰذا مرچ سے کھانا مزے دار ہوتا ہے اور مزیدار ہوتا ہے، تو لوگ خوب کھاتے ہیں اور خوب کھاتے ہیں، تو اس سے قوت و طاقت بنتی ہے اور جب قوت و طاقت بنتی ہے، تو خواہشات پیدا ہوتی ہیں اور اس سے انسان گناہوں میں مبتلا ہوتا ہے، اس لیے میں ہر بیان و وعظ کے آخر میں یہ کہتا ہوں کہ سارا فساد مرچوں کا ہے۔

ان واعظ نے واقعی بڑی حکیمانہ بات فرمائی، اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ شہوتِ بطن کس قدر خطرناک ہے؟ اور وہ کہاں کہاں اثر انداز ہوتی ہے؟

شہوتِ فرج سے دل پر حملہ

آخری شہوت ہے ''شہوتِ فرج''، یعنی شرمگاہ کی خواہش، اس کو کون نہیں جانتا کہ کتنی خطرناک ہے، اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ یہ بھی انسان کے دل پر حملہ کرنے والی شہوت ہے اور اس کی وجہ سے انسان اللہ و رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی نظر میں گر جاتا ہے اور صرف اللہ و رسول ہی کی نظر میں نہیں دنیا والوں کی نظر میں بھی گر جاتا ہے۔

چناں چہ جس آدمی کے بارے میں پتہ چل جائے کہ یہ تو شہوت کا پجاری ہے، تو اس آدمی کی کیا حیثیت و وقعت بنتی ہے، ہم سب کو معلوم ہے۔

اسی لیے ایک حدیثِ ضعیف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مَنْ وُقِيَ شَرَّ لَقْلَقِهِ وَقَبْقَبِهِ وَذَبْذَبِهِ فَقَدْ وُقِيَ الشَّرَّ كُلَّهُ، قَالَ: أَمَّا لَقْلَقُهُ فَاللِّسَانُ وَقَبْقَبُهُ فَالْفَمُ وَذَبْذَبُهُ فَالْفَرْجُ''

(جو شخص لقلقہ اور قبقبہ اور ذبذبہ کے شر سے بچ گیا، وہ تمام شرور سے بچ گیا) پھر فرمایا: لقلقہ زبان ہے، قبقبہ منہ ہے اور ذبذبہ شرمگاہ ہے۔

(شعب الإيمان: ٧/ ٢٩١)

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **''مَنْ يَّضْمَنُ لِي مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَ مَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ أَضْمَنُ لَهُ الْجَنَّةَ''** (جو شخص مجھے ضمانت دے اس کے دو جبڑوں کے بیچ کی چیز اور اس کے دو پیروں کے بیچ کی چیز کی، میں اس کے لیے جنت کا ضامن ہوں)

(بخاري: ٦٤٧٤، مسند أبو يعلىٰ: ٧٥٥٥، سنن بيهقي: ٨/ ١٦٦)

الغرض! یہ شہوتِ فرج بھی انسان کے دل پر اثر انداز ہوتی اور اس کو ہزاروں بیماریوں میں مبتلا کر دیتی ہے، اس لیے اس سے بھی بہت بچنا چاہیے۔

تکبر کے ذریعے دل پر حملہ

شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار جو دل کو تباہ کرنے کے لیے شیطان استعمال کرتا ہے، اس کا نام ہے تکبر۔ یعنی اپنے آپ کو کسی دینی یا دنیوی کمال میں بڑا سمجھنا اور دوسروں کو حقیر سمجھنا۔ اور تکبر عربی لفظ ہے، اور باب تفعل سے ہے اور اس باب کی

ایک خاصیت ''تکلف'' ہے، مطلب یہ ہے کہ آدمی حقیقت میں تو بڑا نہیں ہوتا؛ مگر اپنے آپ کو بڑا بنا کر پیش کرتا ہے اور بڑا سمجھتا ہے۔ تکبر کی وجہ سے آدمی کا دل ناپاک ہو جاتا ہے، شیطان شیطان اسی لیے بنا کہ اس کے اندر تکبر تھا، ورنہ تو وہ بڑا عابد تھا، بڑا زاہد تھا، عالم تھا، لیکن تکبر نے اس کو خاک کر دیا، یہاں تک کہ اس کو آسمانوں سے اُتار کر دنیا میں بھیج دیا؛ بل کہ پھینک دیا گیا۔

تکبر سب سے بڑی بیماری کیوں ہے؟ علما نے لکھا ہے کہ تکبر کی حقیقت دو چیزیں ہیں: ایک اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور دوسرا دوسروں کو حقیر سمجھنا۔ ان دو چیزوں سے تکبر پیدا ہوتا ہے اور اگر ان دو میں سے صرف ایک چیز آپ کو بڑا سمجھنے کی بات پائی جائے، تو اس کا نام عُجب ہے، وہ بھی ایک بُرا خُلق اور بڑی بیماری ہے اور دل کی بیماریوں میں سے ایک خطرناک بیماری ہے، اگر صرف دوسرے کو حقیر سمجھتا ہے، اپنے کو بڑا نہیں سمجھتا، تو یہ دوسرے آدمی کی توہین و تذلیل ہے، یہ بھی اسلام میں ناجائز ہے۔

اور اگر دونوں باتیں ہوں کہ خود کو سب سے اچھا اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے، تو اس کا نام تکبر ہے، معلوم ہوا تکبر کے دو جزو ہیں، دونوں جمع ہوں تو بھی خراب اور اگر الگ الگ پائے جائیں، تو بھی خراب، ظاہر ہے کہ جب ان دو میں سے ہر بیماری خطرہ ہے، تو دونوں کسی میں جمع ہو جائیں، تو کیا اس کا خطرہ اور بڑھ نہیں جائے گا؟ اسی لیے اس کو سب سے زیادہ خطرناک بیماری کہا گیا ہے اور اُم الامراض نام دیا گیا ہے۔

بڑائی اللہ ہی کو سزاوار ہے

بڑائی تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کو سزاوار ہے، وہی اس کا مستحق ہے کہ وہ بڑائی

جتائے اور تکبر کرے، کسی بندے کو کیا حق ہے کہ وہ تکبر کرے؟ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”الكبرياء ردائي والعظمة إزاري، فمن نازعني واحدا منهما قذفته في النار“ (کبریائی میری چادر ہے اور عظمت میری ازار ہے، پس جو شخص ان میں سے کسی میں بھی میرے سے جھگڑے گا، تو میں اس کو دوزخ کا عذاب چکھاؤں گا)۔

(ابو داود: ۴۰۹۰، واللفظ له، ابن ماجه: ۴۱۷۴، مسند أحمد: ۲/۴۱۴، صحیح ابن حبان: ۲/۳۵)

مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی کی شان ہے کہ وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھے؛ اس لیے کہ ساری کائنات کا ہر ذرہ اس کا محتاج ہے اور وہ کسی کا محتاج نہیں اور ساری کائنات بے قدر و بے حقیقت ہے اور اللہ ہر چیز کا مالک اور ہر چیز پر قادر ہے، اس لیے تکبر اس کی صفت ہے اور جو اس کی صفت میں شریک ہونا چاہے، گویا وہ اللہ کی صفت میں اپنے کو شریک کر کے شرک کرنا چاہتا ہے، اس لیے اللہ اس کو عذاب دیتے ہیں، اس لیے کہ اس کے برابر کوئی نہیں نہ ذات میں نہ ہی صفات میں۔

ریاکاری کے ذریعے دل پر حملہ

ریاکاری بھی شیطان کا ایک بڑا ہتھیار ہے، یعنی اللہ کی اطاعت دوسروں کو دکھانے اور خوش کرنے کے لیے کرنا، مثلاً آدمی نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے، تلاوت کرتا ہے، لیکن ان ساری عبادتوں کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ لوگ مجھے دیکھا کریں اور مجھے واہ واہ کہیں، لوگ میرے سے خوش ہو جائیں، میری تعریف کریں، یہ

نیت دل میں رکھ کر عبادت کرنے کا نام ریا کاری ہے۔

اللہ کی نظر میں اس عبادت کا کوئی اعتبار نہیں جو غیر اللہ کے لیے کی جائے؛ بل کہ حدیث میں اسے شرکِ خفی کہا گیا ہے ،ایک تو شرکِ جلی ہے، بتوں کی پوجا کرنا، اللہ کے ساتھ غیر اللہ کو شریک کرنا، ذات میں یا صفات میں یا اس کے افعال میں، یہ کھلا ہوا شرک ہے اور ریا کاری شرکِ خفی ہے، کتنی خطرناک بیماری ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے شرکِ خفی قرار دیا ہے؛ کیوں کہ یہ دیکھنے میں تو خدا کی عبادت ہے؛ لیکن دل میں غیر اللہ کی خوشنودی مقصود ہے، اس لیے یہ شرکِ خفی ہے۔

ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

''قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ اگلے پچھلے تمام بندوں کو جمع کرے گا، تو ایک منادی ندا دے گا کہ جس نے اللہ کی عبادت میں دوسرے کو شریک کیا تھا، وہ انہیں کے پاس جائے جن کو دکھانے کے لیے نیک کام اور عبادت کرتا تھا۔

(ترمذي: ۳۱۵۴،ابن ماجه: ۴۲۰۳ ، مسند أحمد: ۴۶۶/۳،صحیح ابن حبان: ۱۳۰/۲ ، معجم کبیر: ۳۰۷/۲۲)

مطلب یہ ہے کہ ریا کاروں سے یہ کہا جائے گا کہ تمہاری عبادت و نیکی کا ثواب بھی ان لوگوں سے لے لو اور طاعت کا صلہ بھی انہیں سے لے لو اور دیکھو کیا دیتے ہیں؟

نیز ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ''قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ بندوں کا حساب و کتاب لیں گے تو عابد، عالم اور سخی کو اللہ کے دربار میں پیش کیا جائے گا، اور تینوں اپنے اپنے اعمال کا اظہار کریں گے، ارشاد ہوگا کہ یہ سب اعمال تم نے اس لیے کیے ہیں تا کہ لوگ تمہیں کہیں کہ فلاں شخص مجاہد ہے، فلاں شخص بڑا عالم ہے،

فلاں آدمی بڑا سخی ہے اور یہ باتیں تم کو دنیا میں حاصل ہو گئیں، جس مقصد کے لیے نیک اعمال کیے تھے، وہ حاصل ہو چکا۔ لہٰذا اب یہاں کیا چاہتے ہو، جاؤ جہنم میں اوران کو فرشتے اوندھے منہ جہنم میں ڈال دیں گے۔

(مسلم: ۱۹۰۵، نسائی: ۳۱۳۷، مستدرک: ۱/ ۱۸۹)

معلوم ہوا کہ ریا کاری سے کیا ہوا کام اللہ کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا اس لیے کوئی بھی کام کرنے سے پہلے نیت کو خالص اللہ کے لیے کرنا چاہیے، اور دل کو اس بیماری سے محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔

اللہ کی منع کردہ چیزوں سے دور ہو جانا بھی ہجرت ہے

بھائیو! یہ شہوت کا حملہ ان تمام طریقوں سے انسان کے اوپر ہوتا ہے اور جب ان تمام طریقوں سے ہوتا ہے، تو ہم کو اندازہ کرنا چاہیے کہ ہمیں اپنے دل کو کس طرح محفوظ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ اس طرح کے تمام حملوں سے ہم اپنے دل کو محفوظ رکھیں، جب ان تمام چیزوں سے آدمی دور ہو جائے گا، تو یہ دور ہو جانا بھی ہجرت کے قائم مقام ہے۔

چناں چہ حدیثِ پاک کے اندر آتا ہے کہ اللہ کے نبی عَلَیْہِ السَّلَام نے ارشاد فرمایا:

" اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰه عَنْهُ " (مہاجر وہ ہے، جو اللہ کی منع کردہ تمام چیزوں کو چھوڑ دے) (صحیح البخاری، رقم: ۱۰)

بھائیو! ایک ہجرت یہ ہوتی ہے کہ اللہ و رسول کی خاطر ایک ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک چلے جانا، جیسے حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مکے کو چھوڑا اور مدینہ میں جا کر رہنا اختیار کیا، اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بھی مکہ چھوڑ کر مدینہ تشریف لے

گئے۔

اور ایک ہجرت یہ ہے کہ جتنے گناہ و بے حیائی کی باتیں ہیں اور جتنی شہوات ہیں، ان تمام باتوں سے محض اللہ کے لیے اپنے آپ کو بچانا اور دور رکھنا۔ یہ بھی ہجرت کے اندر داخل ہے ،اب ہم کو بھی ہجرت کرنا چاہیے ،جو آدمی یہ ہجرت کرے گا، وہ مہاجر کہلائے گا؛ لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ اللہ کے لیے کرے، دنیا کے لیے نہیں، اللہ کی رضا کے لیے دنیا کو چھوڑ دے۔
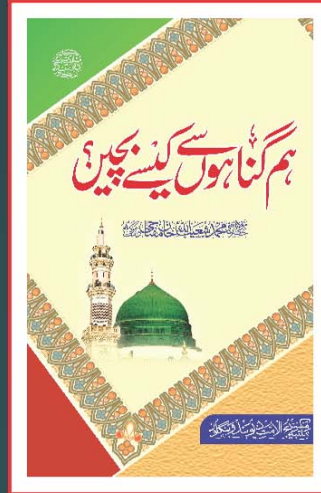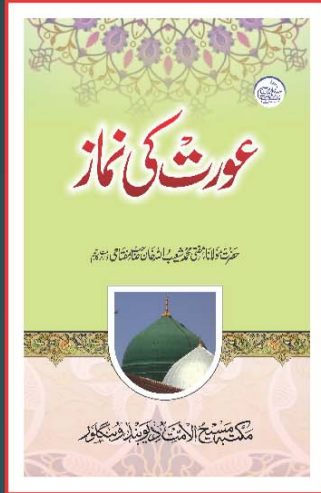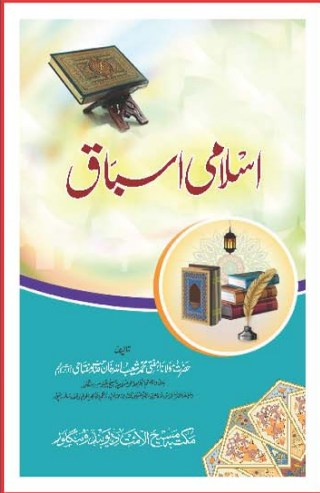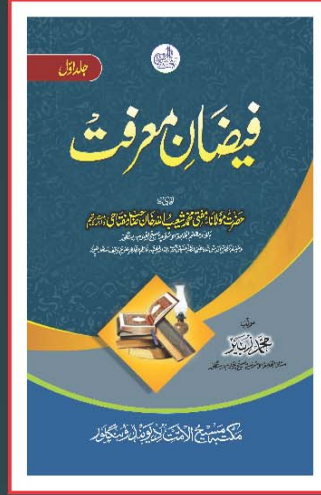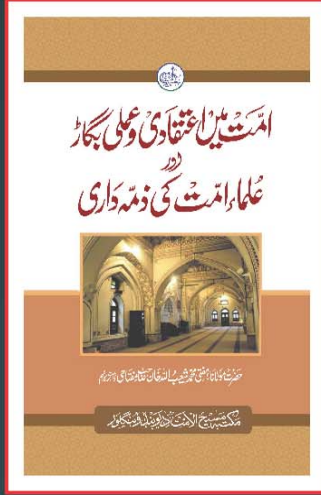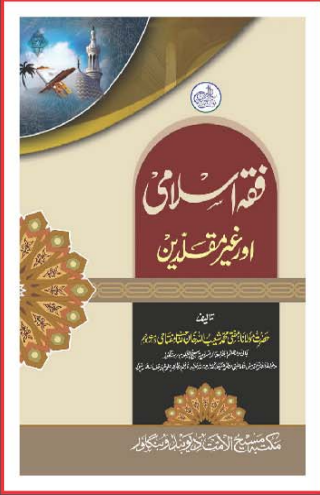
حضرت اقدس کی جملہ کتابیں مفت ڈاؤن لوڈ کرنے اور دیگر مزید گراں قدر
معلومات کے اضافہ کیلئے ہماری ویب سائٹ پر وزٹ کیجئے۔

www.muftishuaibullah.com

MAKTABA MASEEHUL UMMAT DEOBAND
Minara Market, Near Masjid-e-Rasheed, DEOBAND - 247554
Mobile: + 91-9634830797 / + 91- 8193959470
MAKTABA MASEEHUL UMMAT BANGALORE
84, Armstrong Road, Bangalore - 560 001 Mobile : +91-9036701512
E-Mail:maktabahmaseehulummat@gmail.com